رضا کی تازہ تصانیف

ور سراغ

اعِ جاوید

ت چکبست

اور

کلیاتِ چکبست (نظم)

○

رضا کی دیگر مطبوعات

۱ شعلۂ خاموش ۲ شاخِ گل
۳ دعائے صباح ۴ شورشِ پنہاں
۵ اُجالے ۶ دی سائیلنٹ فلیم
۷ ہندوستانی مشرقی افریقہ میں ۸ متعلقاتِ غالب
۹ مکتوباتِ جوش ملسیانی بنامِ رضا ۱۰ منشوراتِ جوش ملسیانی
۱۱ چکبست اور باقیاتِ چکبست - اور ۱۲ - شعورِ غم (انتخاب)

○

ساکار پبلشرز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۰۷ جولی بھون نمبر ۱، ۱۰ نیو میرین لائنز
چرچ گیٹ - بمبئی ۲۰ - ۴۰۰۰۲۰

ادب، آرٹ، کلچر کا ترجمان

(سہ ماہی)



تناظر
دہلی



ستمبر ۱۹۸۳ء

مدیر

بلراج ورما

ناشر و طابع: بلراج ورما

سرورق:- صادقین

کتابت: لقاء الرحمٰن - محمد عمر خاں - محمد صلاح الدین قاسمی

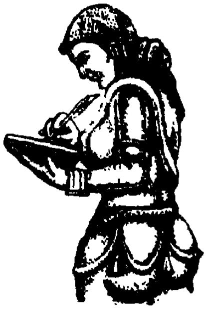
طباعت: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز۔ دہلی

قیمت: ۱۲ (بارہ) روپے

سالانہ (چار شمارے) ۴۰ چالیس روپے

تقسیم کار

تناظر پبلی کیشنز - ۲۴۲ ڈی میور وہار - پاکٹ ۳
دہلی - ۱۱۰۰۹۱



مندرجات

امکان

تناظر کا یہ چوتھا شمارہ ہے۔ چار سال میں چار قدم۔ ظاہر ہے کہ یہ رفتار فی زمانہ سست مانی جائے گی۔ میں قصوروار ہوں۔

یہ شمارہ جو دو سال قبل یعنی میرے حکومت ہند کی ملازمت سے سبکدوش ہوتے ہی تیار ہو گیا تھا۔ آج چھپ رہا ہے۔ اس دوران میں سنگیت ناٹک اکادمی کے انگریزی سہ ماہی "سنگیت ناٹک" کی ادارت میں مشغول رہا۔ اکادمی کی ملازمت کی دوسری چند ایک شرائط کے علاوہ ایک شرط یہ بھی تھی کہ میں کسی دوسرے پرچے سے تعلق نہ رکھوں۔ ملازمت میری ضرورت تھی اور آپ جانتے ہیں کہ ضرورت بڑی ظالم ہوتی ہے۔

اب میں ہر لحاظ سے فارغ یعنی آزاد ہوں۔ چاہوں بھی تو اب مزید کسی قسم کی ملازمت کا کوئی امکان نہیں، لہذا میں نے تناظر کو ایک بار پھر سے زندہ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اور باقاعدہ ڈیکلریشن بھی لے لیا ہے۔

اس شمارے میں خاصی معقول شاعری، مقالوں اور تبصروں کے علاوہ چند کہانیاں بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ اس پرچے سے ظاہر ہے میری کوشش رہے گی کہ تناظر ادب کے علاوہ ہمارے عصری آرٹ اور کلچر کی ترجمانی بھی کرے ــــــ پرفارمنگ (موسیقی، رقص وغیرہ) اور پلاسٹک (مصوری، سنگ تراشی وغیرہ) اردو ادب تقریباً ناآشنا ہے۔ کبھی کبھار کوئی مضمون کسی ادبی جریدے میں نظر آجاتا ہے تو خوشی سے زیادہ حیرت ہوتی ہے کیوں کہ فنونِ لطیفہ میں دل چسپی رکھنے والا قاری نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو جریدے اپنی حفاظت اور بقا کے لیے اس قسم کے مضامین شائع کرنے سے کتراتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جناب راج نرائن راز مدیر "آجکل" نے کسی قدر جرأت سے کام لیا ہے مگر اس کی ایک حد تک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ اس خوش نصیب جریدے کی سرپرست حکومت خود ہے

پچھ سالوں سے گجراتی مراٹھی اور بنگالی تھیٹر کے ساتھ ساتھ ہندی تھیٹر بھی آگے آرہا ہے مگر اردو کے وسیع وعریض احاطے میں اس قسم کا کارہائے نمایاں ابھی تک انجام نہیں دیا جاسکا باوجودیکہ اردو کسی مخصوص علاقے کی نہیں پورے ہندوستان کی زبان ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس کمی کو کسی حد تک پورا کرسکوں۔ اپنے اس منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لیے میں فنون لطیفہ میں دل چسپی رکھنے والے اپنے کرم فرماؤں سے تعاون کا خواستگار ہوں۔

اپنے پچھلے شمارے (تناظر ۳) میں برصغیر کے فنکاروں کے نام اپنے "کھلے خط" میں میں نے لکھا تھا:

"میں ایک مدت سے کوشاں ہوں کہ آپ کے محبوب تناظر کے کچھ آئندہ نمبر اردو کی چند اہم ادبی شخصیتوں کے فکروفن کے لیے مخصوص کر دیے جائیں اور ان کی ترتیب اس طرح ہو کہ نہ صرف ہمارے لیے بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے بھی یہ خصوصی شمارے تحقیق وتخلیق کی مستند دستاویز قرار پائیں۔"

عرصہ ہوا محترمی محمد حسین آزاد (مرحوم) نے آبِ حیات کے دیباچہ میں تحریر فرمایا تھا:

"میرے دوستو زندگی کے معنیٰ کھانا، پینا، چلنا، پھرنا، سورہنا اور منھ سے بولے جانا نہیں۔ زندگی کے معنیٰ یہ ہیں کہ صفات خاص کے ساتھ نام کو شہرتِ عام ہو اور اسے بقائے دوام ہو۔ اب انصاف کرو کیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ خوبیاں بہم پہونچائیں۔ انھیں بقائے دوام کے سامان ہاتھ آئیں اور اس پر نام کی زندگی سے محروم رہیں۔ بزرگ بھی وہ بزرگ کہ جن کی کوششوں سے ہماری ملکی اور کتابی زبان کا لفظ اور حرف حرف گراں بارِ احسان ہو۔ ان کے کاموں کا اس گمنامی کے ساتھ صفحۂ ہستی سے مٹنا بڑے حیف کی بات ہے۔ جس مرنے پر ان کے اہل د عیال روئے وہ مرنا نہ تھا۔ مرنا حقیقت میں ان باتوں کا مٹنا ہے جس سے ان کے کمال مرجائیں گے اور یہ مرنا حقیقت میں سخت غمناک حادثہ ہے"

اردو تہذیب کی برادری میں ہندو، مسلمان، سکھ عیسائی سبھی شریک ہیں۔ اگرچہ اس میں دوسری کوئی رائے نہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کا حصہ اردو ادب کی تشکیل میں نسبتاً زیادہ ہے مگر کون انکار کرے گا کہ اس وسیع قومیت میں چکبست، پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور ایسے سیکڑوں ہندو اور سکھ بھی شامل رہے ہیں۔ اردو کے پرانے اور نسبتاً گمنام ادبا، اور شعرا کو حلقۂ شام وسحر سے نکال کر بقا بخشنے کی جو سعی پچھلے دس بارہ سالوں میں کالی داس

گپتا رضا صاحب نے کی ہے وہ ہمارے ادب کی عصری تصویر کا ایک جگمگاتا باب ہے۔انہوں نے مرحوم آزاد کے کام کو جس لگن، محنت اور کاوش سے آگے بڑھایا ہے اس کا احترام ہم سب اردو والوں پر یکساں لازم ہے۔لہذا ہم نے اگلے دو شمارے اس عظیم فنکار اور محقق کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ خصوصی شمارے ہندو پاک کے ادبی تعاون کی تاریخی دستاویز ہوں۔

مجھے ہر اس ادیب اور ناقد کے تعاون اور رہنمائی کی توقع ہے جس نے رضا صاحب کے کام کو دیکھا پرکھا ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ رضا کے فکر وفن کے کسی بھی پہلو کو لے کر بلا جھجک ورعایت بحث کریں تاکہ تناظر کے قارئین پر اس فن کار کا وہ پہلو اجاگر ہو کر سامنے آجائے۔

ڈیکلریشن کی شرائط کے مطابق تناظر مارچ، جون، ستمبر اور دسمبر کی دس تاریخ تک چھپ جانا چاہیئے۔ اکثر اردو رسالوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ کبھی مقررہ وقت پر نہیں نکلتے میری کوشش رہے گی کہ حتی المقدور اس شرط کو نبھاؤں۔

میں اس شمارے کی نگارشات کے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کروں گا۔جو ہے آپ کے سامنے ہے۔ میں صرف وعدہ کر سکتا ہوں کہ تناظر کا ہر آئندہ قدم ترقی کی طرف بڑھے گا،اور میری کوشش رہے گی کہ تناظر کے قاری کو اس کا مواد پڑھتے پرکھتے وقت کوفت نہ ہو

تناظر ہمارے ادب، آرٹ اور کلچر کا ترجمان اور ہر اس فنکار اور قاری کا پرچہ ہے جو ان امور میں دل چسپی رکھتا ہے۔

O

ہماری پالیسی

ہندوستانی ثقافت وتہذیب کا تحفظ اور ارتقا قومی اور بین الاقوامی یک جہتی کی پاسداری، صالح عالمی اقدار کی دریافت وبازیافت، جمہوریت، سیکولرزم اور انسان دوستی کا فروغ، ادب اور تنقید کی صحیح سمت اور رفتار کا تعین، نئی نسل کی ذہنی وحسی تہذیب وتشکیل اور فن کی بنیادی اقدار کی تلاش اور ازسرنو ترویج واشاعت — یہی ہمارے اغراض ومقاصد ہیں

اور

تناظر کوئی تجارتی ادارہ نہیں،
ایک تحریک ہے۔
تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی تجربات کا
دارالعمل

اغراض ومقاصد

جس کا مقصد ایسے تعمیری ادب کی بنیادیں
تیار کرنا ہے جو ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی
بین الاقوامی قدروں کا احاطہ کریں

بلراج ورما

ادیب سہیل (پاکستان)

میاں تان سین

"تان سین جیسا باکمال موسیقار ہزار برس کے اندر پیدا نہیں ہوا۔" ابوالفضل

تعجب ہے کہ تان سین کے متعلق آئین اکبری میں ابوالفضل نے بھی چند جملوں سے زیادہ نہیں لکھا۔ تان سین کی عظمت کے معترف ہوتے ہوئے بھی ابوالفضل نے اس کے متعلق تفصیلات میں جانے سے نہ جانے کیوں اور کس مصلحت کی بنا پر احتراز کیا۔ اگر آئین اکبری میں یہ چند جملے نہ ہوتے تو سند کے ساتھ تان سین کے دور کا تعین بھی مشکل ہو جاتا۔ مختلف ذرائع سے جو پیدائش اور وفات کی تاریخیں حاصل ہوئی ہیں وہ اس قدر اختلافی ہیں کہ قاری کے ساتھ ساتھ اہل علم حضرات کے لئے بھی کسی نتیجے پر یقین کے ساتھ پہنچنا وقت طلب ہے تان سین ہی پر کیا موقوف ہے اس کے ہم عصروں میں کسی کے متعلق صحیح اور تفصیلی معلومات فراہم ہونا مشکل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس دور میں کسی فنکار کی شخصیت اور اس کے فن پر مضامین لکھنے کا رواج کم تھا۔ ان کے متعلق جو معلومات ہم تک پہنچتی رہی ہیں وہ ناکافی ہیں، اور سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں۔

یہ بات بھی نہیں کہ ہم میں سے ایسے صاحب علم نہیں جو فن موسیقی کے دونوں شعبوں (میرا مطلب ہے تحریری اور عملی) پر یکساں قدرت نہ رکھتے ہوں۔ پاک و ہند میں یقیناً ایسے بہت سے افراد ہیں جو اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے حضرات آگے آئیں اور اپنی فنی بصیرت کو بروئے کار لاکر آنے والوں نسلوں کو اس بے چارگی سے بچالیں جس کا آج کی نسل شکار ہے۔ میرا مطلب ہے فنکاروں کی زندگی کے حالات، شخصیت اور فن کے بارے میں جاننے کے لئے جس طرح ہم آج مضطرب ہیں۔ ہماری اولادوں کو اس کرب و اضطراب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

بہرحال میاں تان سین کے سلسلے میں مختلف ذرائع سے جو مواد فراہم ہوسکے ہیں ان کی ترتیب یوں ہو سکتی ہے۔

میاں تان سین بیہٹ کے ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ کا نام مکرند پانڈے تھا اور میاں تان سین کا اس وقت کا نام ترلوچن داس۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ایک صوفی بزرگ حضرت

محمد غوث گوالیاری کے زیر سایہ ہوئی۔ اس کا سبب یوں بتایا جاتا ہے کہ کرنڈ پانڈے کے گھر کوئی اولاد نہ ہوتی تھی اس زمانے میں کسی کے گھر اولاد نہ ہونے کو خاصا بڑا حادثہ خیال کیا جاتا تھا۔ کرنڈ پانڈے کو جب ان بزرگ کی خبر لگی تو وہ ان کے حضور میں پہنچے اور اپنی بپتا سنائی۔ حضرت غوث نے جواباً کہا کہ تیرے گھر ایک لڑکا پیدا ہوگا وہ تیرا نام روشن کرے گا۔ کرنڈ کے گھر سال بھر بعد تان سین پیدا ہوا، خوشی منائی گئی اور جب چار پانچ سال کا ہوا تو کرنڈ پانڈے نے اس کی تعلیم و تربیت کے لئے حضرت غوث گوالیاری ہی کا انتخاب مناسب سمجھا۔ کچھ محقق حضرت غوث اور تان سین کی قربت کو ذرا مختلف انداز میں پیش کرتے ہیں لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ تان سین کی شخصیت کی تعمیر میں حضرت غوث محمد کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ ان بزرگ کے ملنے والوں میں متھرا کے سوامی ہری داس بھی تھے جو ان کے یہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ اور یہیں سے تان سین کا تعارف سوامی ہری داس سے جو ان کے فن موسیقی کے استادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں نائک بخشو کی صاحبزادی (مقیم حیدر آباد دکن) کا بھی ذکر کیا ہے جو اپنے باپ کی صحیح نمائندہ تھی۔ ان کے علاوہ نائک بخشو کے دو بڑے جانشین مچھوا اور بھنور کا بھی گان ودّیالہ گوالیار میں ساتھ رہا ہے۔ وہ گان ودّیالیہ جسے دھرپد کے موجد اور وقت کے بڑے نائک راجہ مان سنگھ نے قائم کیا تھا۔ اور جس کے اعلیٰ مشیر کاروں میں خود اُس کی بیوی مرگ نینی شامل تھی۔

عجب اتفاق دیکھئے کہ تان سین کی بیوی حسینی (مرگ نینی کی شاگرد) کی بھی پرورش حضرت محمد غوث ہی نے کی تھی۔ وہ بھی برہمن لڑکی تھی اور تب اس کا نام پریم کماری تھا۔ ان ساری تفصیلات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تان سین اور حسینی کی شخصیت و فن کی تعمیر میں اس مثلث نے بہت اہم فرائض انجام دیئے ہیں جس کی تین شاخیں، حضرت غوث محمد، سوامی ہری داس اور گان ودیا گوالیار (یعنی مرگ نینی، راجہ مان سنگھ اور بخشو نائک)۔

تان سین ابتدا میں شیر شاہ کے لڑکے دولت خان کے پاس تھا جس سے اسے بہت قربت تھی۔ اس کے بعد وہ عزت و احترام کے ساتھ راجہ رام چند بگھیلہ کے یہاں رہنے لگا۔ راجہ رام چند نے اس کے فن کے احترام میں اس کی سواری کو کاندھا تک لگایا۔ انعام و اکرام کی تو انتہا کر دی تھی۔ جب اس کی شہرت شہنشاہ اکبر تک پہنچی تو اس نے سردار جلال الدین کرچی کے ذریعے اپنے دربار کے لئے مانگ لیا۔ (ایک روایت کے مطابق زین خان نے اکبری دربار تک پہنچایا تھا۔)

تان سین نے مختلف راگ بھی اختراع کئے ہیں جن میں درباری کانہڑا، میاں کی ٹوڈی، میاں کی ملہار، میاں کی سارنگ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ راگوں کی مناسبت سے بولوں کی تصنیفات بھی جابجا کتابوں میں مل جاتی ہیں۔ عطیہ بیگم فیضی کی تحریر کے مطابق ٹھاٹ کی پہلی ترتیب کا کام بھی تان سین ہی نے

شروع کیا تھا۔ہندوستانی موسیقی (کرناٹکی موسیقی اس میں نہیں آتی) میں آج بھی سب سے زیادہ میاں تان سین اور ان کی اولادوں کی گائیگی ہی کا عمل دخل ہے اور ہر دور میں دوسری گائیکی کے مقابلے میں سے ہی مقبولیت حاصل رہی ہے۔خود فرماں روائے اودھ واجد علی شاہ جیسی عظیم شخصیت نے بھی دربار کی زینت کے لئے میاں تان سین ہی کی اولاد میں سے پیار خاں، باسط خاں اور جعفر خاں کا انتخاب کیا اور زانوئے تلمذ ان کے آگے تہ کیا۔ان سے قبل محمد شاہ فرماں روائے دلی کے درباری گویوں میں بھی تان سین کے نواسوں کے گھرانے کے ایک بزرگ میاں نعمت خان سدا رنگ مشہور و معروف ہوئے اور خیال کو ایک نئے سرے سے بنا سجا کر قبول عام کا درجہ دیا۔جن کے سینکڑوں بول آج بھی زباں زد ہیں۔پنڈت وی۔این۔بھاتکھنڈے اسی کے گھرانے کے ایک بزرگ محمد علی خاں کے شاگرد تھے۔استاد حافظ علی خاں اور استاد علاؤالدین خاں اس دور کے عظیم سرود کار بھی اسی گھرانے کے ایک بزرگ اور رام پور کے درباری سرود کار وزیر خاں کے تربیت یافتہ ہیں۔

گوالیار کے رہنے والے خلیفہ بادل خاں، محمد شاہ کے دربار کے چھنگے خاں کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور چھنگے خاں میاں تان سین کی بیٹی کی اولاد میں سے میاں سدا رنگ کے خوشہ چینوں میں تھے۔

بنارس کے رہنے والے پنڈت سدرشن شاستری جی تان سین کی اولاد میں سے ایک عظیم سازکار امرت سین کے شاگرد تھے۔

گوالیار کے راجہ کے خاندان کے ایک فرد بھیا جی گنپت راؤ نے وینا استاد بندے علی خاں سے سیکھی تھی۔اور بندے علی خاں سین خاندان کے فرد تھے۔

بڑے سرودکار استاد کرامت اللہ کی تعلیم و تربیت بھی سین خاندان کے افراد سے ہوئی تھی۔

رام پور کے عظیم سرودکار فدا حسین نے بھی سین گھرانے سے یہ فن حاصل کیا تھا۔پوربی اور پچھمی باج کے استادوں اور رہبروں میں تھے۔راگ ودّیا اور راگ اور گت پر ماہرانہ دسترس تھی۔اندور کے مشہور کے بین کار مجید خاں صاحب استاد بندے علی کے شاگرد تھے۔اس طرح ان کا تعلق بھی سین گھرانے سے ہو جاتا ہے۔یہ تو ہوئیں بڑی بڑی ہستیاں۔ان کے علاوہ اور بھی نہ جانے کتنے رباب کاروں سرود کاروں اور بین کاروں نے میاں تان سین کی اولادوں کی اولاد سے اس عظیم ورثے کو حاصل کیا ہے اور کر رہے ہیں۔محمد علی خاں نے ٹھیک ہی کہا تھا ہندوستانی موسیقی کی ترویج و اشاعت میں سین خاندان کا سب سے بڑا حصہ ہے۔رباب کاری کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ میاں تان کے بیٹے کی طرف سے چلا اور بین کاری بیٹی کی طرف سے۔میاں تان سین کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔بیٹے بلاس خاں (معدن الموسیقی

میں داماد بتلایا گیا ہے۔ جو غلط معلوم ہوتا ہے) ترنگ سین، سرت سین، صورت سین اور بیٹی سرسوتی تھی۔ سرسوتی کی شادی مصری سنگھ (راجہ سموکھن سنگھ کے بیٹے) سے ہوئی تھی بمعدن الموسیقی کے مصنف نے سموکھن سنگھ ہی کو تان سین کا داماد بتایا گیا ہے۔ جو قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ راجہ سموکھن سنگھ تان سین کا ہم عصر تھا اور اکبر کا درباری تھا جس کا نام قبول اسلام کے بعد نوبات خاں (؟) پڑا تھا۔

اب اپنے محترم قارئین کی مزید معلومات اور دلچسپی کے لئے بیٹے اور بیٹی کی جانب سے میاں تان سین کی اولادوں کے شجرے بھی اگلے صفحے پر درج ہیں۔

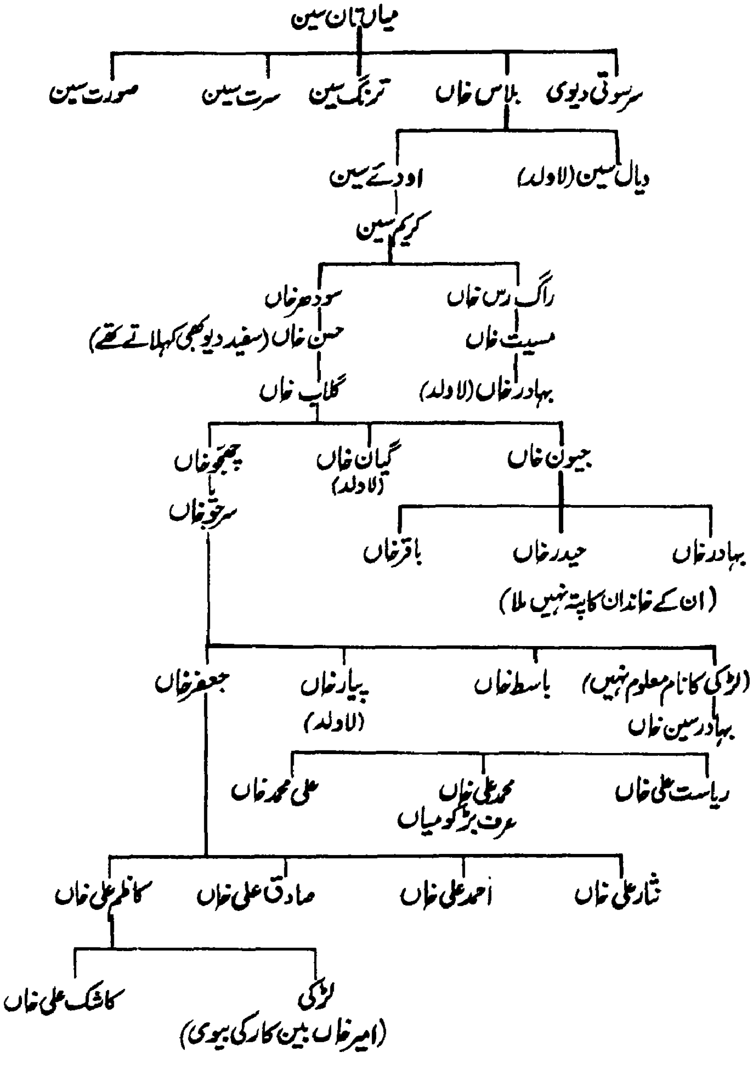


موسیقی کی ایک محفل

بیٹی کی طرف سے

- مصری سنگھ (میاں تان سین کی بیٹی سرسوتی کا شوہر)
  - حسن خان
    - حسین خاں
      - واحد خاں یا بازید خاں
        - نظیر خوش خال خاں
          - لعل خاں
            - نعمت خاں سدا رنگ
              - بھوپت خاں مہا رنگ
                - پیار خاں انگلی کٹ
                - جیون شاہ
                  - نرمل شاہ
                    - لڑکی کا نام معلوم نہیں
                  - چھوٹے نوبت خاں
                    - امراؤ خاں
                      - رحیم خاں (لاولد)
                      - امیر خاں داماد کاظم علی خاں
                        - فیاد علی خاں یا فیاع علی خاں
                        - وزیر خاں
                          - صغیر خاں (لاولد)
                          - نصیر خاں (لاولد)
                          - نذیر خاں
                            - دلدار خاں
                            - دبیر خاں
                            - جمن خاں
              - فیروز خاں ادا رنگ
  - شیر خاں (لاولد)

بیٹے کی طرف سے



صادقین

جلالؔ و جمال کا پیکر ایک قلندر

صادقین کے نام سے ادب اور آرٹ کی ساری دنیا واقف ہے۔ اگر یورپ انھیں ایک بڑے مصوّر کے طور پر جانتا ہے تو عرب ممالک ایک بہت بڑے مصوّر اور خطاط کے طور پر۔ برصغیر میں صادقین ایک عظیم مصوّر، ایک بے مثال خطاط اور رباعی گو شاعر کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔

اس عالمگیر شہرت کی کیا وجہ ہے ؟

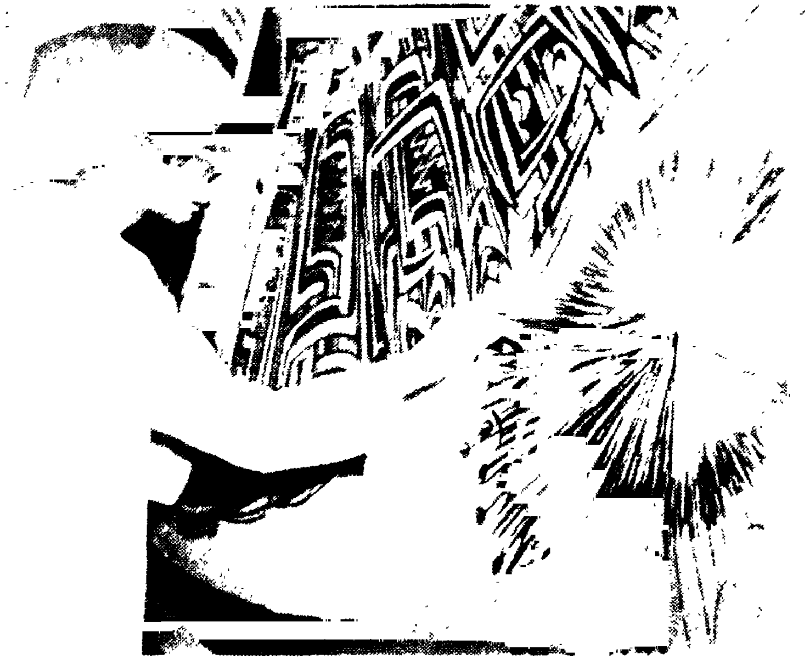
رباعی گوئی اردو شاعری میں نسبتاً مشکل صنفِ سخن مانی جاتی ہے۔ خطاطی (خصوصاً جس قسم کی صادقین کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے) بھی کوئی ایسی سہل شے نہیں۔ نقاشی اور مصوری تو ظاہر ہے کہ محنت اور ریاضت کے بغیر اپنے معراج کمال تک کبھی بھی نہیں پہونچتیں۔

یہ مشکل پسندی صادقین ایسے قلندر کے ہاں کیسے آئی ؟

ہم نے صادقین صاحب کی شخصیت اور ان کے فکر و فن پر ایک بھرپور مقالہ شائع کرنا طے کیا تھا مگر صاحب مضمون کسی سے وجہ سے وہ مقالہ نہ بھجوا سکے۔ لہذا فی الحال ان کی مصوری اور خطاطی کے ان چند نمونوں پر ہی اکتفا کیجئے۔

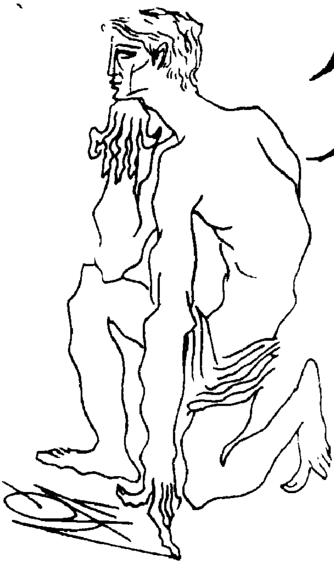








جو نقش تھے پامال بنائے میں نے
پھر الجھے ہوئے بال بنائے میں نے
تخلیق کے کرب کی جو کھینچی تصویر
تو اپنے خد و خال بنائے میں نے



کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
کاش کے ہوتا قفس کا در کھلا





گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ڈاکٹر وہاب اشرفی



مظہر امام رشتہ گونگے سفر کا

مظہر امام کے دوسرے شعری مجموعہ "رشتہ گونگے سفر کا" کا مطالعہ کرتے وقت ان کے پہلے مجموعے کا مجموعی مزاج ذہن میں رکھیے تو ایک ارتقا پذیر شعری حیثیت کی کیفیت از خود واضح ہوجائے گی۔ بدلتے ہوئے شاعرانہ آہنگ کی تفہیم کے لیے اور متعلقہ روایتی اقدار کے تسلسل کے لیے "رشتہ گونگے سفر کا" کا مطالعہ نہ صرف دلچسپ بلکہ سود مند بھی ہے۔ اگر شاعری بے نام منزلوں کی تلاش ہے، اپنے آپ میں اُترنے کی سعی ہے، اپنی ناگزیر جستجو ہے، حالات و کوائف کو دیکھنے، سمجھنے اور ان کی تخلیقی غیر میکانکی تعبیر ہے تو اس باب میں "رشتہ گونگے سفر کا" یقیناً ایک معیاری مثال ہے۔ ایسی تمام باتوں کا خام مواد تو "زخم تمنا" میں بھی مل جاتا ہے لیکن اس کی پختہ کار صورت زیر بحث نئے مجموعے میں ملتی ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مظہر امام کے پاس کوئی ایسا عقیدہ نہیں رہا جو ان

کے پورے وجود کو کوئی واضح مفہوم دے سکے، جب کوئی نادر پیام بھی اپنا معنی کھو دے۔ فلسفہ، سیاست، یہاں تک کہ مذہب اپنے منصب سے گر جائے اور ان میں کوئی دلکشی باقی نہ رہے تو پھر آزمائے ہوئے ٹکسال کے سکّے بنے ہوئے الفاظ بھی لایعنی بن جاتے ہیں۔ ایسے میں انفرادی، نئے اور عجوبے تجربے تخلیق کی جولانگاہ بن جاتے ہیں۔ مجھے بار بار احساس ہوتا ہے کہ مظہر امام کے لیے تمام رشتے گونگے بن چکے ہیں، وہ اپنی دیکھی اور برتی ہوئی راہوں کے لیے بھی اجنبی بن گئے ہیں۔ اس لیے کہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت اعتماد کے سارے طلسم ٹوٹ چکے ہیں۔ وہ مجموعے کی پہلی نظم "تمہارے لیے ایک نظم" میں کہتے ہیں :

وہ الفاظ جن کے سہارے کبھی ہمکلامی کے آداب سیکھے تھے میں نے
وہ الفاظ اپنے مفاہیم کی کینچلی پھینک کر
دشتِ بے معنویت میں گُم سُم کھڑے ہیں

جانے بوجھے الفاظ کو سکتہ آگیا ہے، ان کی معنویت گم ہو چکی ہے، اور ان سے جو روابط بنے تھے، آداب کی عمارت تعمیر ہوئی تھی، جن پہ تہذیب کا ڈھانچہ کھڑا تھا، سب منہدم ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اب جو راستہ ہے وہ اجنبی ہے، اور جو منزل ہے وہ بھی اجنبی۔ "رشتہ گونگے سفر کا" کے سطور ہیں :

اور میں
وقت کی رہ گذر کا وہ تنہا مسافر
جو ہر قافلے سے الگ، رہ رَوؤں سے الگ
اجنبی سمت
یوں چل رہا ہے
کہ اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے

مظہر امام بڑے موثر انداز میں عقیدے کی شکست وریخت کو تجسیم (PERSONIFICATION) کی صنعت میں بیان کرتے ہیں ۔ ان کے لیے عقیدے زخمی ہو چکے ہیں، یہ ایک عالم جاں کنی میں ہیں، ان کے خواب بے معنی بن چکے ہیں، قدریں جو کبھی عزیز تھیں موت سے ہمکنار ہیں، زندگی میں کوئی رجائی عنصر نہیں ۔ یہ احساسات یوں تو اکثر جدید شاعری میں برتے گئے ہیں لیکن مظہر امام انہیں قرار واقعی شاعرانہ سج دھج کے ساتھ بیان کرتے ہیں، ایک ہی ٹکڑے میں کئی صنعتوں کا ادغام ان کے طریقۂ کار کو انفرادی آہنگ دے دیتا ہے تشبیہ و استعارہ کی منزلوں سے گذرتے ہوئے خوبصورت امیجری قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی ۔ مثلاً " اُکھڑتے خیموں کا درد" کی یہ سطریں :

عقیدے نیزوں کے زخم کھا کر سسک رہے ہیں
یقین کی سانس اُکھڑ چکی ہے
نڈھال خوابوں کے ہونٹ سے خاک و خوں کے شعلے ابل رہے ہیں
عزیز قدروں پہ جانکنی کی گرفت مضبوط ہو گئی ہے
پتنگ کی طرح کٹ چکے ہیں تمام رشتے
جو آدمی کو قریب کرتے تھے آدمی سے
دلوں میں جن سے شعاعیں قوسِ قزح کے آنچل کی پھوٹتی تھیں
نہ فرد کا سائباں سلامت
نہ انجمن کا مکاں سلامت

فرد اور انجمن کا یہ نوحہ لازمی طور پر مظہر امام کی عرفانِ ذات یا HUMAN PREDICAMENT کی طرف لے جاتا ہے ۔ اسے فرار کہیے یا زندگی کی تفہیم کے بارے میں رومانی تصور سے وابستگی، لیکن یہ صورت تواتر

سے مظہر امام کے یہاں برتی گئی ہے۔ وہ ایک حساس شاعر کی طرح ذات کے کرب، تنہائی کے بچھو کے، قدروں کی شکست و ریخت، رشتے ناطے کی پائمالی اور مجموعی زندگی کی بے معنویت کے بعد کہیں آکر ٹھہرتے ہیں تو اپنی پہچان کے مسلسل عمل کے کارزار میں۔ ان کی نظمیں جن کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا، ان کے علاوہ "دھوپ میں ایک مشورہ" "ایک صبح مری ہوئی" "آئینہ سے ٹپکتا لہو" "آنگن میں ایک شام" اور "کنگال آدرش" "عرفانِ ذات کے وسیلے ہیں۔ مظہر امام بچوں کی سی معصومیت اور سادگی سے پتے کی بات کہتے ہیں ——— اب دیکھئے محبت کی محرومی کا المیہ۔ نظم "پوسٹ نہ ہونے والا ایک خط" میں یہ المیہ یوں بیان ہوا ہے:

کئی مہینے ہوئے
ایک ماہ نامے میں
تمہارے بچوں کی تصویر میں نے دیکھی تھی
بہت ہی بھولے، بہت ہی حسین بچے ہیں
بس ایک لمحے کو
ایسا خیال آیا تھا
یہ بچے
کاش
مجھے
"ماں"
پکارتے ہوتے

اسی طرح نظم "کھلے آسمان کے نیچے" میں وہ محبوب کے الطافِ بے پایاں

کی رات اور اس کے خلوص بے پرواو بے نیاز کو اس طرح Sum - UP کرتے ہیں:

میری جانب سے کوئی تحفہ نہیں
زیور نہیں
ساڑی نہیں
اُجرت نہیں
حد تو یہ، شادی کا وعدہ بھی نہیں!

ٹھیک ہے کہ یہ بہت عظیم شاعری کے نمونے نہیں، لیکن جو IRONICAL SITUATIONS ہیں وہ قاری کے احساس کو مہمیز ضرور لگاتے ہیں۔ ایسے ہی ذہنی افق کی توسیع کرنے والی "ٹھہرے ہوئے لمحے سے پرے" "وہ ایک بات" اور "رات کا قصہ" ہیں ـــــ یہ اپنے آپ میں چھوٹے چھوٹے افسانے ہیں جن میں وحدت تاثر کی فضا شعری آہنگ میں ڈھل گئی ہے۔

مظہر امام کی غزلوں میں جدید حسیت تو اور بھی نمایاں ہے۔ وہ تمام امور جو نظموں کے باب میں بیان ہوئے، ان کی مثالیں ان کی غزلوں سے بھی دی جا سکتی ہیں۔ یہ تو فکری رویّہ ہے جو نظموں اور غزلوں دونوں ہی میں مشترک ہے لیکن غزلوں کی ایک مجموعی روایت پر نظر رکھئے تو مظہر امام کے یہاں ایک نئی فضا اور ایک نیا انداز ملے گا۔ پرانی علامتوں کو ترک کرنے اور نئی علامتیں وضع کرنے میں مظہر امام کسی بھی جدید شاعر سے پیچھے نہیں۔ ان کے یہاں روایتی تلازمے خال خال ہیں۔ مظہر امام کی غزلوں میں جدلیاتی الفاظ کی کثرت ہے، اس لیے مفاہیم تہہ دار بن کر اُبھرتے ہیں اور ایک وسیع و عمیق تخلیقی قوت کا پتہ دیتے ہیں۔ مُشتے نمونہ از خروارے، یہ مثالیں دیکھئے:

بے چہرہ منظروں کو بھی کچھ خدوخال دے   اس تیز روشنی میں اندھیرا اچھال دے

وہ روشنی ہے کہ آنکھوں کو کچھ سجھائی نہ دے
سکوت وہ کہ دھماکہ بھی اب سنائی نہ دے

اُس طرف سے جب دیکھوں بند کھڑکیاں دیکھوں
پُرسکوں گھروں میں بھی، کیا وہی ہے ہنگامہ؟

یہ سب EPIGRAM کی مثالیں ہیں۔ یہ PARADOXES لفظوں کو نئی معنویت دیتے رہتے ہیں اور ہمارے افکار کی سرحدوں کی توسیع کرتے ہیں۔ جدید حسیت سے لبریز کتنے ہی اشعار ہیں اس مجموعہ کلام میں جو ان کی شاعری کی فکری روش اور نئے لب و لہجے کی لذت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

مظہر امام کی ایک غزل ہے، جس کی ردیف ہے ۔" آدھی رات گئے "۔ یہ پوری غزل نئے لب و لہجے میں EROTIC شاعری کی بڑی خوبصورت مثال ہے۔ جن حضرات نے خسرو کی " شب جائے کہ من بودم " پڑھی ہے، وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس غزل کی موسیقی اُسی حد تک فردوسِ گوش بن گئی ہے۔

مجموعہ " رشتہ گونگے سفر کا " میں کچھ آزاد غزلیں بھی ہیں۔ ایسی غزلوں کا ہر شعر مجھے جاپانی " ہائیکو " کی صنف سے قریب معلوم ہوتا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث کی ضرورت ہے، جس کی یہاں گنجائش نہیں۔

بہرحال " رشتہ گونگے سفر کا " جدید شاعری کے امکانات کو مزید روشن کرتا ہے اور اس کے مطالعے سے مظہر امام کے شعری ارتقا کا حد درجہ احساس ہوتا ہے۔

مہدی جعفر

کنور سین کے افسانے

کتھا کا عمل انتظار حسین کی کہانیوں میں نظر آتا ہے اور انتظار حسین ناصر کاظمی کے اس ریمارک پر بہت خوش بھی ہوئے ہیں کہ تمہارا اکٹھا ہوا ڈبہ افسانہ نہیں ہے کتھا ہے۔ مگر انتظار حسین بنیادی طور پر داستانوی زبان کے بنا ٔض ہیں اور ان کی اہمیت اسی بازیافت میں ہے۔

برخلاف اس کے کنور سین نے ہندوستانی کتھا کو اپنی کہانیوں یا اپنے تخلیقی عمل کا مرکز بنایا ہے۔ انھوں نے کتھا کی زبان استعمال کرنے میں مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ کتھاؤں کی زبان کو اُردو زبان کے ساتھ گھُلانے ملانے کی سعی کے ساتھ اس آمیزے کو رواں دواں کر دیتے ہیں۔ یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ کنور سین ہندی الفاظ کے اور یجینل ٹیسٹ کو برقرار رکھتے ہیں اور عموماً شدھ الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ اُردو زبان کو عصری سطح پر ENRICH کرنے کی اچھی کوشش ہے۔ ایک سوال اٹھتا ہے کہ قدیم ہندوستانی کلچر سے برآمد شدہ کتھاؤں کی زبان کس حد تک آج کے دور کی آفاقیت کو سمیٹ سکتی ہے؟ اگر آج کی بول چال سے اس کی آمیزش کی جائے تو یہ آمیزش کیا ہوگی؟

میں نے کنور سین اور انتظار حسین کا تقابل ایک خاص نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ انتظار حسین اور کنور سین کے اپروچ میں ایک بنیادی فرق اور ہے۔ انتظار حسین

کے یہاں ناسٹلجیا کی کارفرمائی شدید ترین صورت میں نظر آتی ہے جب کہ کنور سین کے یہاں ناسٹلجیا شاذونادر ہی نظر آتا ہے۔ یہ فرق دونوں فنکاروں کے الگ الگ تخلیقی رویوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ انتظار حسین کے یہاں ہجرت کا تجربہ ان کے افسانوں کی آنچ کو بہت تیز کرتا ہے۔ کنور سین کے یہاں اس طرح کے کسی اور Additional تجربے کی آنچ کم ہے۔ چنانچہ افسانے کسی حد تک مطمئن اور ٹھما ٹھما اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں۔ ایک میانہ روی دیکھی جا سکتی ہے۔ جو سخت سے سخت، زخمی سے زخمی اور تند سے تند کیفیات کو مدھم اور ملائم کرتی نظر آتی ہے۔ جملوں کے درمیان ٹینشن (Tension) یا فیوژن (Fusion) کی کمی ہے باوجودیکہ جملے Compact ہوتے ہیں اور ان میں غیر ضروری تفصیلات نظر نہیں آتیں۔ ان کے جملوں کا مزاج بل کھانے والا نہیں ہوتا۔ حالانکہ مدّوجزر اور آہنگ اکثر نمایاں ہوتا ہے۔ وہ اپنے پلاٹ کو ٹریٹ کرتے ہوئے سطحیں بدل دیتے ہیں۔ اچانک پن لے آتے ہیں نئے نئے رُخ پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر جہاں کہیں گھماؤ پھراؤ اُبھرتا ہے وہ بگولے جیسی بے ساختگی نہیں ہوتی۔ ان تمام باتوں کے باوجود ان کے یہاں تخلیقی عمل پورے آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔

کیا کنور سین اپنی مدھیم یا درمیانہ روش کو فنی جلا بخشنے میں کامیاب ہونے کی سکت رکھتے ہیں؟ کنور سین کی کہانیاں ان کی حمایت کرتی نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی اکثر کہانیوں میں فیوژن (FUSION) سے گریز اور ماورا ہونے کے رجحانات نظر آتے ہیں۔ وہ افسانے پر قابو حاصل کرکے اسے ٹکڑوں میں بانٹتے ہیں یہ سارے ٹکڑے اپنا اپنا اثر اس طرح ڈالتے ہیں کہ افسانہ اپنا ایک الگ تاثر بنا لیتا ہے۔ افسانہ کاویری، گلیڈ ییٹر، اوپر کا پانی، اس کی اچھی مثال ہیں جن میں کئی کہانیاں یا زندگی کے مختلف تجربات کی کہانیاں یا مختلف ادوار کی کہانیاں

بیک وقت لڑی کی طرح پیش کی گئی ہیں۔

کنورسین کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں سوچنے کا عمل گہرا ہے۔ سوچ کے عمل کو وہ تلازمے کے تسلسل سے جوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ قاری کو ٹوٹی یا بکھری چیزوں کو اپنے طور پر نہ ملانا پڑتا ہے اور نہ فکری انتشار سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے خام مواد کو تکنیکی مناسبت سے ایک تسلسل میں پیش کرتے ہیں۔

البتہ فکر کا تصادم حسیت سے ہوتا ہے۔ مختلف کتھاؤں کے فکری پہلوؤں کو کتھاؤں سے ابھرنے والے احساسات سے ٹکرا دیا جاتا ہے۔ اس تصادم کے ذریعہ کنورسین عصریت کی صورت حال کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اکثر اساطیر اور عصریت میں رشتہ تلاش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں بنیادی انسانی نفسیات میں تبدیلی نظر نہیں آتی یہ ضرور ہے کہ عصریت اور تاریخی سطح کی تبدیلیاں انسانی نفسیات کی تابع ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کنورسین کا درمیانہ اظہاری رویہ ان کے افسانوی اپروچ کے عین مطابق ہے۔ چند مثالیں۔

(ا) آج تو وہ کتھا سُنا کر رہوں گا۔

ایک آدمی کی سیوا سے خوش ہو کر مہاتما نے اسے 'امر پھل' دیا جو کھائے امر ہو جائے۔

'راجہ ہی امر پھل کا ادھیکاری ہے'، آدمی نے سوچا۔ راجہ نے امر پھل رانی کو دے دیا۔ اپنے پریم کی نشانی۔ رانی نے یہ پھل اپنے پریمی مہاوت کو دے ڈالا۔ مہاوت نے اسے اپنی پریمکا ویشا کو دے دیا۔ ویشا نے راج سبھا میں آکر یہ پھل راجہ کو بھینٹ کیا۔ راجہ پھل کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ راج پاٹ چھوڑ کر جنگل کو چلا گیا۔

کتھا سماپت ہوئی تو وہ بے چین ہو گیا، جیسے کوئی بچّہ کھلونے کو توڑ کر اُسے

جوڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ (بھوت لنگم)

(۲) کوروکشیتر کی بات جانے دو۔

اِس مہایُدھ میں میرے ساتھ عجیب بات ہوئی ۔ میں وہاں جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں تو اپنی پریوگ شالہ میں قدرت کے ساتھ جوجھ رہا تھا۔ اس کے سینے میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہاڑ پاتال اور سمندر کا بھید جاننے میں لگا تھا' آکاش میری نظروں کو بھانپ رہا تھا۔ اور . . . . . . تبھی میرے کانوں میں رن بھیری گونجنے لگی ۔ میں اپنے کو بھول گیا ۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ پچھتانے لگتا!

تمُ وشواش کرو میں کسی یُدھ میں اپنی مرضی سے نہیں گیا۔ کوئی دوسرا مجھے کھینچ لے گیا۔ یہ بوکھلا جاتا ۔تم نہیں جانتیں آدمی بیٹھے بیٹھے کیا سے کیا ہو جاتا ہے ۔ (گلیڈیٹر)

(۳) مجھے سٹپٹاتا دیکھ کر وہ ہنس پڑا !

شانتا کو جانتے ہو؟ وہ گمبھیر ہو گیا ۔تم نہیں جانتے بڑی عجیب لڑکی تھی ۔ راہُل سے پیار تھا اس کو ۔ کہتی تھی راہُل نہیں تو میں بھی نہیں ۔ راہل کو کینسر ہو گیا ۔ بیماری کے بڑھتے ہی اس نے کراہنا شروع کیا تو شانتا سوچ میں پڑ گئی۔ اتنی بھیانک کراہ ۔ ! ایک دن وہ ڈاکٹر کو لے کر آئی ۔ اس نے راہُل کو زہر کا ٹیکہ لگوا دیا۔ اس کراہ ہی کے ساتھ جیون بتانے سے اچھا ہے میں اس کی یاد کے سہارے زندگی کاٹ دوں (کاویری)

اوپر کے اقتباسات میں فکر اور حسیّت کا داخلی یا خارجی ٹکراؤ دیکھا جاسکتا ہے ۔ پہلے اقتباس میں فکر کی حیثیت داخلی ہے ۔ جب کہ حسّیت خارجی طور پر نظر آتی ہے ۔ امر پھل کا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پہنچنا فکر سے زیادہ حسّیاتی

عمل ہے۔ مگر آخر کار جو نتیجہ بر آمد ہوتا ہے وہ فکر کو مہمیز دیتا ہے۔ دوسرے اقتباس میں فکر کی حیثیت خارجی ہے مگر یکایک تبدیلی کا احساس داخلی حسّیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ اقتباس تین میں حسّیت اور فکر کا براہِ راست ٹکراؤ ہے۔ فکر حسّیت پر غالب آتی ہے۔ خارجی دُنیا میں فکر کو اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ منفعت کا ذریعہ ہے۔

کنور سین کے یہاں فطرت کا مشاہدہ ایک مخصوص نہج پر پہنچ کر بہت گہرا ہو جاتا ہے۔ وہ انسان کی داخلی فطرت ہو کہ مناظر کی خارجی فطرت دونوں کی نبض شناسی اس وقت زیادہ کھُل کر کرتے نظر آتے ہیں جب تبدیلی رونما ہو رہی ہو یعنی یا فِطرت کی تبدیلی خواہ لمحاتی ہو خواہ غیر لمحاتی اُسے وہ بہ خوبی گرفت میں لیتے ہیں۔ چنانچہ نیچر کی تبدیلی یعنی بدلی ہوئی یا بدلتی ہوتی ہوئی فطرت کی ترجمانی ان کے افسانوں میں ہر عنوان سے دیکھی جا سکتی ہے (نیچر کی تبدیلی عموماً ریورس (Reverse) یا برعکس ہوتی ہے) خواہ وہ آدمی کی فطرت ہو، جانور کی، قدرتی مناظر کی، یا ماحول کی فطرت۔ آدمی کی فطرت کی تبدیلی اقتباس تین میں واضح ہے۔ جسے افسانہ کاویری سے اخذ کیا گیا ہے۔ افسانہ 'کاویری' کُلی طور پر عورت کے نیچر کے بدل جانے پر مبنی ہے۔ افسانہ 'بھوت لنگم' میں مرکزی کردار کی انسانی مزاج کو سمجھنے والی فطرت اچانک برعکس ہو جاتی ہے۔ مرکزی کردار خارجی طور پر عورت کو تپسیا بھنگ کرنے اور بکھراؤ پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتے سمجھتے اچانک اپنے آپ کو موردِ الزام قرار دیتا ہے اور خودکشی کر لیتا ہے۔ افسانہ 'ڈاکٹر' میں مریض کے ذہن پر کینسر جیسے مہلک مرض کے اثرات کا نیچر بدل کر برعکس ہو جاتا ہے۔ اور وہ آپریشن سے پرہیز کرتا ہے۔ افسانہ 'نیلا تھوتھا پینے والا' میں کُتّے کی فطرت بدل جاتی ہے اور وہ متوقع فطرت سے مختلف اور برعکس نظر آتا ہے۔

اس شام دفتر سے لوٹا تو راجو اور دلّو میرے ساتھ آ لپٹے۔

ڈیڈی کالو پھر بھاگ گیا۔

کیا کہا؟ میں شانتا کی طرف دیکھا۔

میں نے نہیں بھگایا وہ تن گئی۔

ممی ٹھیک کہتی ہیں۔ اس نے کچھ نہیں کیا۔ کالو ہمارے ساتھ کھیل رہا تھا کہ باہر سڑک پر آوارہ کتّے آ گئے۔ ہمیں چھوڑ کر وہ ان کے ساتھ بھاگ گیا۔

بچّے تڑپ اٹھے۔

میں پھر کہتی ہوں جو گڈھیلوں کا نہ ہوسکا وہ ہمارا کیسے ہوتا۔ شانتا نے گیان بگھارا۔ ایک تو کتّا وہ بھی گیا گزرا۔

اس کی بات سن کر مجھے گڈھیلوں کا گھوڑا یاد آ گیا۔ وہ اس دن شام کو نہ اپنے تھان پر تھا نہ کہیں آس پاس۔ پچھلے دنوں ان کی دو بکریاں اور ایک بھیڑ بھی گم ہوگئی تھی۔ کچھ مرغیاں بھی غائب، میرا وچار تھا وہ گڈھیلوں کے پیٹ میں چلی گئیں۔ لیکن گھوڑا؟ سردار کی انگارے برساتی نگاہیں میرے سامنے ابھرنے لگیں۔

بابو جانور سے زیادہ پیار کرنا ٹھیک نہیں۔

میں نے کالو کو بھلانے کا فیصلہ کر لیا۔

(نیلا تھوتھا پینے والا)

اس افسانے میں کنور سین بہت کامیاب ہیں کہ انھوں نے اپنی تخلیقی رو کو بڑی حد تک ابھار دیا ہے۔ افسانہ 'منزل' میں منزل کی طرف بڑھنے کے باوجود اور اس کے قریب پہنچنے کے بعد منزل کی فطرت بھی برعکس ہو جاتی ہے۔ جیسے لمبے سفر کے بعد اچانک انکشاف ہو کہ دراصل سفر کیا ہی نہیں گیا۔

سامنے پھیلی ہوئی دھند کو دیکھ کر اس نے قہقہہ لگایا۔ اب منزل دور نہیں۔
اسے پار کرتے ہی . . . . تبھی اس نے دیکھا میں پیچھے کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا
رہا ہوں۔ وہ ٹھٹھکا اور میری طرح گردن گھما کر پیچھے کو دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں
پھٹی رہ گئیں۔ پیچھے پہاڑ جوں کا توں کھڑا تھا۔ جنگل لہلہا رہا تھا اور سمندر گرج
رہا تھا۔ وہ سکتے میں آ گیا اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے آس پاس کو اچھا دھاری سانپ
کا روپ دھارن کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ لگتا ہے ہم وہیں ہیں جہاں سے چلے تھے۔
اس بار تو . . . . . (منزل)

اسے محض اتفاق کہا جا سکتا ہے کہ بعینہ اسی طرح کا ریورسل انتظار حسین کے ایک افسانے 'خواب اور تصویر' میں ملتا ہے۔ دونوں افسانوں کا اختتام یکساں ہے۔ کنور سین اپنے MYTHICAL TREATMENT اور کتھا والے انداز میں انوکھے نظر آتے ہیں۔

نیچر کی تبدیلی افسانوں میں مختلف عنوان سے نظر آتی ہے۔ جن میں سے چند کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے۔ طرہ یہ ہے کہ جملوں کے اندر بھی نیچر کی تبدیلی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ٹانگ کی گڑیا کے چند جملوں پر غور کر سکتے ہیں۔

اس دن میں بہت اُداس تھا ——— (چھوٹا جملہ، مخصوص دن، راوی کے نیچر کی تبدیلی)

اپنے آخری دنوں میں وہ بھی اُداس رہنے لگا تھا ———
(ذرا بڑا جملہ، ایک خاص دور، بنیادی کردار کے نیچر کی تبدیلی)

ان دنوں اس کے بھگتوں کی بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ وہ ان کی طرف دھیان جو نہ دیتا۔ ان کے بجائے وہ اپنے کُتّے میں زیادہ دل چسپی لینے لگا تھا ———
(جملہ زیادہ طویل ہو جاتا اس لیے اسے تین ٹکڑوں میں تبدیل

کر دیا گیا ہے - اس میں تبدیلی کا خارجی ردِ عمل بیان کیا گیا ہے
اور گزرے ہوئے دنوں کی اداسی سے نئی دلچسپی کی طرف
بڑھنے کا عمل ظاہر ہوا ہے)۔

میرا خیال تھا۔ اوگھڑ پیر کو اپنے لنگڑا ہونے کا کوئی غم نہیں۔ لیکن اُس کے آخری دنوں میں میرا بھرم ٹوٹنے لگا۔ میں اس کی بے چینی کا کارن کھوجتے ہوئے اس کی بائیں ٹانگ کو دیکھتا رہتا۔ وہ بھی اُسے ٹٹولتا ہوا اندر ہی اندر ٹوٹتا رہتا۔

——— (جملہ اور بھی طویل ہو گیا ہے۔ اسے دو جگہ سے توڑ دیا گیا ہے۔
یہاں راوی اور بنیادی کردار کا تفاعل ہے)

غرض کہ یہاں سے افسانہ چھوٹے دائروں سے نکل کر ایک بڑے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس میں کئی کردار باہم تفاعل کرتے ہیں اور ایک خاص تبدیلی جو برعکس ہوتی ہے دیکھنے میں آتی ہے یعنی کُتّا اپنی فطرت بدل دیتا ہے۔

پیر کافی ہاؤس کو جاتی باقی سیڑھیوں کو غمناک آنکھوں سے دیکھتا ہوا کتّے کو سہلانے لگا ——— ' اب مجھے اس جانور کا ہی بھروسہ رہ گیا ہے '۔

مجھے خاموش کھڑا دیکھ کر بولا۔ ' شاید تم حیران ہو گے۔ یہ بھکارن کا کتّا نہیں۔ جو اپنی مالکن کے مرتے ہی اس کی لاش کو لاوارث چھوڑ کر روٹی کی تلاش میں نکل گیا تھا ——— '

. . . .

کافی ہاؤس کی اکیسویں سیڑھی پر قدم رکھتے ہی میں نے جو کچھ دیکھا۔ اس نے میری روح سُن کر دی۔

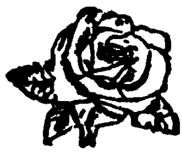
پیر چت لیٹا تھا اس کے سینے پر ایک ٹانگ کی گڑیا اوندھی پڑی اس کی داڑھی چوم رہی تھی۔ اُس کا کُتّا بڑے شوق سے اس کی آدھی ادھوری ٹانگ کو چبا رہا تھا۔

مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ غرّایا اور مجھ پر جھپٹا۔ میرے پیچھے ہٹتے ہی اس نے پھر اپنے دانت لنگڑی ٹانگ میں گاڑ دیے۔

کنور سین کے افسانوں میں غیر تکمیلیت اور نامکمل پن کا احساس ابھارا جاتا ہے۔ کوئی چیز مستقل نہیں جس پر بھروسہ کیا جا سکے چاہے وہ کیفیت ہو، فطرت ہو، فلسفہ یا تاریخ ہو یا کچھ اور چیز۔ مستقل نہ ہونے کی وجہ سے ایک کمی کا احساس رہتا ہے، ایک گھاٹے کی نمائندگی ہوتی ہے، ایک کسر باقی رہ جاتی ہے۔ یہ چیزیں یارو یتے اسی لیے برعکس ہوتے ہیں کہ وہ مکمل میں ختم ہو جانے کے بجائے نامکمل کی اونچائی تک پہنچنے کے بعد واپس لوٹ آتے ہیں۔ ان کی فطرت الٹی ہو جاتی ہے۔ ایک ٹانگ کی گڑیا نامکمل پن یا گھاٹے کا احساس دلاتی ہے۔ گلیڈ بیٹر، افسانے میں اسی کسر کی وجہ سے آدمی اپنی سکون والی فطرت پر قائم نہیں رہتا۔ بلکہ جنگ سامان ہونے لگتا ہے۔ جیسے کسی کمی کو وہ پورا کرنا چاہتا ہو۔ اس کمی پر عبور نہ ہونے کی صورت آخر میں نظر آتی ہے۔ جب بنیادی کردار خودکشی پر اُتر آتا ہے۔ سکون سے اضطراب کا پیدا ہونا اور اضطراب سے سکون کا آدمی کے نامکمل ہونے کا اشارہ ہے۔ کاویری، میں بھی تبدیلی کا عنصر واضح ہے۔ یہ تبدیلی کمی کے عنصر کو ابھارتی ہے۔ کیپٹن، راوی کے بہ نسبت خود میں کمی کو محسوس کرتا ہے اور کاویری بھی۔ کاویری اس کمی کا فائدہ اُٹھاتی ہے۔ یہ فائدہ اٹھانا خود ایک کمی ہے جسے کاویری اپنے آپ میں نہیں پہچانتی۔ کیپٹن اپنی کمی کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور اسے چھپانے کے جنون میں اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ دوسری طرف راوی کو حسن کی ہوس اور زندگی کی روانی میں اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کیپٹن کس کرب سے گزرے گا۔ راوی کی طرح کاویری بھی کیپٹن کے احساسات سے نابلد رہتی ہے یا پھر اُسے جان بوجھ کر نظرانداز کرتی ہے۔

کنور سین نکھار سنوار اور تراش خراش پر توجہ دیتے ہیں۔ الفاظ اکثر

صوتی آہنگ میں نظر آتے ہیں۔ جملوں یا ذیلی جملوں کا اختتام کبھی کبھی ایسے الفاظ پر ہوتا ہے جن میں قدیم طرز کی قافیہ آرائی جھلکتی ہے۔ حالانکہ ابھی بھرپور پختہ کاری نظر نہیں آتی، تاہم یہ ایسا سلسلہ ہے جو ہم تحریر کے ساتھ نکھرتا ہے اور اس میں جاذبیت بڑھتی ہے۔ کنور سین کے افسانوں میں سے مرصع جملے ڈھونڈ نکالنا مشکل نہیں۔ البتہ اکثر افسانے ایسے جملوں کی تکرار پر قائم ہوتے ہیں جس میں اختتام "تا" پر ہوتا ہے جیسے لکھتا اٹھتا بیٹھتا آتا جاتا وغیرہ۔ لہذا اردو طرز تحریر میں بہت بھلے نہیں لگتے۔ یہ انداز ہندی میں زیادہ مقبول ہے اردو میں اس کا چلن عام نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کنور سین کے یہاں فیوژن کا عمل جو الفاظ یا جملوں کو قدرے پیچیدہ کرکے کثیر المعنویت میں اضافہ کرے، کم کم ہے۔ زبان کی روانی، کہانی کہنے کا ڈھنگ صاف ستھرا انداز اور اعتماد کنور سین کے افسانوں کو ایک وقار بخشتا ہے۔





ندا فاضلی

نوحہ

کسی کو ٹوٹ کے چاہا
کسی سے کھنچ کے رہے
دکھوں کی راحتیں جھیلیں، خوشی کے درد سہے
کبھی بگولہ سے بھٹکے، کبھی ندی سے بہے

کہیں اندھیرا ہے
کہیں روشنی
کہیں سایہ
طرح طرح کے فریبوں کا جال پھیلایا
پہاڑ سخت تھا، برسوں میں ریت ہو پایا



ندا فاضلی

بس یوں ھی جیتے رھو

بس یونہی جیتے رہو
صبح جب سو کے اٹھو
گھر کے افراد کی گنتی کر لو
ٹانگ پہ ٹانگ رکھے روز کا اخبار پڑھو
اس جگہ قحط گرا
جنگ وہاں پہ برسی
کتنے محفوظ ہو تم شکر کرو
ریڈیو کھول کے فلموں کے نئے گیت سنو
گھر سے جب نکلو تو
شام تک کے لیے ہونٹوں پہ تبسم سی لو

دونوں ہاتھوں میں مُصافحے بھر لو
منہ میں کچھ کھوکھلے بے معنی سے جملے رکھ لو
مختلف ہاتھوں میں سکّوں کی طرح گھستے رہو
کچھ نہ کہو
اجلی پوشاک
سماجی عزّت
اور کیا چاہیے جینے کے لیے
روز مل جاتی ہے پینے کے لیے
بس یونہی جیتے رہو !

ندا فاضلی

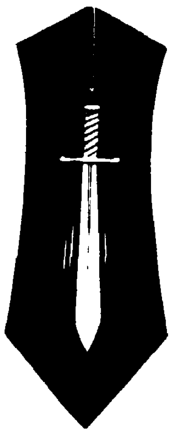
گیت

دھوپ بھری چھت پر برس گیا پانی
آنگن میں آکے
انگیٹھی بجھا کے
ناگن سا لہرا کے ڈس گیا پانی
گلیوں میں منڈلائیں بادل سے
آکاش ڈھونڈیں دوپٹوں کے چہرے
چھم چھم اجالے، چھما چھم چھما چھم اندھیرے
بنیا کے تاروں سا
کَس گیا پانی

کھڑکی اندھیروں میں کھڑکی کو کھینچے
موسم نہ دیکھے کبھی آگے پیچھے
لیکن گلی اپنی آنکھیں نہ میچے
تھانہ کچہری میں
پھنس گیا پانی
چھپّر کی کٹیا نہ کنجی نہ تالے
جب چاہے برسات نیندیں چرالے
روٹی کو بیلے یا گھر کو سنبھالے
جلتے توے پر
جھلس گیا پانی

ندا فاضلی

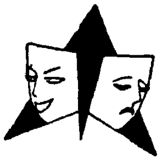
بمبئی



یہ کیسی بستی ہے
میں کس طرف چلا آیا
فضا میں گونج رہی ہیں ہزاروں آوازیں
سلگ رہی ہیں ہواؤں میں ان گنت سانسیں
جدھر بھی دیکھو!
کھوے، کولھے، پنڈلیاں، ٹانگیں
مگر کہیں کوئی چہرہ نظر نہیں آتا
یہاں تو سب ہی بڑے چھوٹے اپنے چہروں کو
چمکتی آنکھوں کو، ٹانگوں کو، ہنستے ہونٹوں کو
سروں کے خول سے باہر نکال لیتے ہیں!
سویرا ہوتے ہی جیبوں میں ڈال لیتے ہیں!
عجیب بستی ہے، اس میں نہ دن، نہ رات، نہ شام

جھلستی ٹین کی کھولی میں چاند سوتا ہے
یہاں تو کچھ بھی نہیں ریل اور بسوں کے سوا!
زمیں پہ رینگتے بے حس سمندروں کے سوا!
عمارتوں کو نگلتی عمارتوں کے سوا!
یہ قبر قبر جزیرہ کسے جگاؤ گے
خود اپنے آپ سے الجھو گے
ٹوٹ جاؤ گے..... یہاں تو کوئی بھی چہرہ نظر نہیں آتا

کمار پاشی



ابتدائیہ

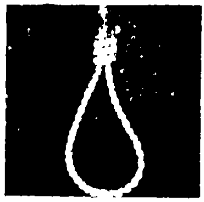
۳۶۵ دنوں میں ایک دن ایسا چنیں
صبح کو ہم گھر سے نکلیں
اور آدھی رات تک سڑکوں پہ بے مقصد پھریں
شہر سے باہر
کسی ویران گوشے میں
چرس کے
چار چھ سگرٹ بنائیں
اور زہریلے دھوئیں کو پیٹ کے اندر بھریں
یونہی چلتی بس میں چڑھ جائیں
کہیں بھی جا رکیں
اور انجانی جگہوں پر
کوئی واقف کار ڈھونڈیں
مانگ کر چائے پئیں

۳۶۵ دنوں میں
زندگی کا ایک دن
کچھ اس طرح ضایع کریں

اختتامیہ

کچھ نہیں ہے
ایسا لگتا ہے کہ میرے پاس اب کچھ بھی نہیں ہے
جو بھی کچھ تھا کب کا ضایع کر چکا ہوں
زیست مجھ کو جانے کب کا کھا چکی ہے
رفتہ رفتہ ——
بزم اپنے خاتمے پر آ چکی ہے
مے کی وہ بوتل ہوں جو پی جا چکی ہے

کمار پاشی



ایک شخص

یوں تو آدھی رات گئے وہ گھر جاتا ہے
لیکن خود کو یہیں کہیں وہ دھر جاتا ہے
بیٹھے بیٹھے کھو جاتا ہے دھند میں اپنی
جانے ایسا کون ہے جس سے ڈر جاتا ہے
ہونے کا احساس کرا دیتا ہے سب کو
محفل میں ہر شخص کو تنہا کر جاتا ہے
رنگ سہانے لے جاتا ہے ساتھ وہ اپنے
ایک کسیلا زہر ہوا میں بھر جاتا ہے

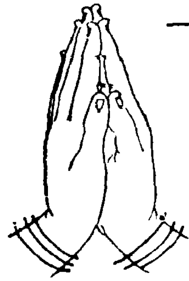
ایک اور شخص

اسے ہر شہر سے تم اجنبی بن کر گزرنے دو
نجانے کون سا غم ہے اسے
کس درد کے نشے میں وہ مخمور رہتا ہے
جو سچ پوچھو
تو خود سے بھی وہ کوسوں دور رہتا ہے

وہ گھر میں ہے، وہ دفتر میں
وہ بازاروں میں، گلیوں میں
اسے ہر صبح دیکھو گے، اسے ہر شام دیکھو گے
بیاضِ دل پہ اس کی کچھ مٹے سے نام دیکھو گے
وہ اک افسانۂ غم: ہر دلِ بسمل میں ملتا ہے
جدا ہر بزم سے ہے اور ہر محفل میں ملتا ہے
کبھی وہ روبرو ہوگا، کبھی اوجھل میں دیکھو گے
کبھی تم اسکو جگمگ رات کے آنچل میں دیکھو گے

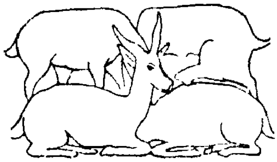
وہ خود میں مر چکا اب اسکو کچھ بھی کر گزرنے دو
اسے روکو نہ تم اب ہر بلندی سے اترنے دو
اندھیروں میں بکھرنے دو

کمار پاشی



وشنو ماں کی چوکھٹ پر

جو بھی کچھ اچھا تھا دل میں
کھو چکا ہوں
نامرادی کا سفر طے کرتے کرتے
آج پھر اک بار ماں
تیرے در تک آ گیا ہوں
دیکھ کتنا ڈھیٹ ہوں میں
جانتا ہوں
اب بھی دامن کو مرے بھر دے گی تو اچھائیوں سے
اور اب بھی
میں گنوا دوں گا انہیں گھر لوٹنے تک
اپنے اندر کی گھنی پرچھائیوں میں



جو لوگ لوٹیں گے

پرانے شہر سے جب لوگ لوٹیں گے
مجھے پہچان لیں گے
میری گردن میں وہی زنجیر ہو گی
جو مجھے بخشی گئی تھی وقتِ پیدائش

میں کہہ دوں گا کہ میں خاموش ہوں اب تک
دکھا دوں گا لباسِ خوں چکاں اُن کو
شکستہ جسم و جاں ان کو

پرانے شہر کے لوگو !
کبھی آؤ —
مری دھرتی کی مٹی سے مجھے باہر نکالو
میرے ہونے کی گواہی دو
پرانے شہر کے لوگو —

کمار پاشی

دور اس جزیرے سے

سُنا ہے کہ جب اُس جزیرے کے سہ منزلہ جھونپڑوں پر اندھیرا اُترنے لگے گا
سبھی مشعلیں جل اٹھیں گی
لباس اس کا
اونچے درختوں تلے
دور سے سرسراتا نظر آئے گا
اور کنارے پہ ٹھہری ہوئی میری کشتی
ہرے پانیوں پر پھسلنے لگے گی

یہ میرے پرانے زمانے میں دیکھے ہوئے
چند خوابوں کا کوئی ادھورا ورق ہے
مجھے اس میں شک ہے

میں اک گمشدہ جسم کی وہ روپہلی چمک ہوں

جو سر سبز وادی کے گنجان پیڑوں میں جا کر
کہیں لاپتہ ہو گئی ہے
ہوا دھیمی رفتار سے چل رہی ہے
کنارے کی کشتی
پھسلتی ہوئی
ایک بے سمت منزل کی جانب چلی جا رہی ہے
میں تنہا ——
کنارے کی نم ریت پر
اپنے بے روح ڈھانچے سے باہر کھڑا ہوں
اداسی کی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہوں

یہاں سے وہاں تک
کٹھور اور مغرور پانی کا سناٹا پھیلا ہوا ہے
بہت دور ——
گہرے دھندلکوں میں لپٹا ہوا
اک جزیرہ نظر آ رہا ہے

ساحل احمد

چھ منی نظمیں

درخت کے پاؤں

درخت کے پاؤں
اندر تک چلے گئے ہیں
نقطے اور دائرے
سمٹ کر انگلیوں میں رہ گئے ہیں
زرد پانی
بھاپ بن کر اڑ رہا ہے
پتھر ٹوٹ کر
جسم بن گئے ہیں
درخت کے پاؤں اندر تک چلے گئے ہیں

کلنڈر کا جسم

کمرے کی بھیگی زرد ہواؤں میں
کلنڈر کے جسم پھڑپھڑاتے ہیں

ایک اک کر کے ساری تصویریں
نقطوں کی دیواروں سے اڑنے لگتی ہیں
اور ہواؤں میں
لہو کی بو
سانسوں کی آہٹ
بڑھتی ہے

استحصال :

نیم کے درخت کی کوکھ میں
اک دوسری ذات کا پودا
اُگ رہا ہے
اور آدمی کی طرح
نیم کے درخت کا
استحصال کر رہا ہے

دھوئیں کا پرندہ

دیکھ نہ پایا ـــــ کالا رنگ اور دھواں
دروازہ پھولوں میں لپٹا
گیلی کھڑکی پر نیلاہٹ جمی ،
گھلی ،

ننگے لمحوں میں جل کر مرا
دھواں بن کر
غلافوں میں
خوش بو چھپاتا گیا
پرندہ بنا

رات کی بات

رات کو بلی چھت پر ٹین بجاتی ہے
پنجرے کا بوڑھا طوطا شور مچاتا ہے
آنکھ مری جو، کھل جاتی ہے
دور خلا میں تکتا ہی رہ جاتا ہوں
ٹیک لگا کر تکیہ پر،
پھر سو جاتا ہوں
رات کو بلی،
چھت پر ٹین بجاتی ہے
پنجرے کا بوڑھا طوطا
شور مچاتا ہے

ابہام

سو طرح لوگ
چل کر،

تناظر ۴

ریل کی پٹری تک
دیکھنے جاتے ہیں
سگنل کو
اسٹیشن کی طرف
جب کہ
پٹریوں کا سیاہ جسم منقوط ہے
ابہام کی سرحدیں ناپیں
اسٹیشن اور سگنل



اختر بستوی

چار نظمیں

(۱)

آشوبِ دورِ آہن

رقص ہر جانب مشینی بھوت کا
حکمرانی ہر طرف فولاد کی
اجتماعی زندگی کا شور و شر
روح ہر سُو مضطرب افراد کی
آرزوئیں زیرِ دامِ روزگار
خواہشوں پر غلبۂ فکرِ معاش
دورِ آہن میں سکوں کی جستجو
دوپہر میں اپنے سائے کی تلاش

(۲)

بازگشت

صحرا کی اک چیخ میں ڈھل کر
چرخ کے گنبد تک جاتا ہوں
بازگشت کے روپ میں، واپس
انسانوں تک لوٹ آتا ہوں
سنتے ہیں پھر لوگ مجھے یوں
سر کو جھکا کر خاموشی سے
جیسے سُنیں الہامی کلمے
اہلِ عقیدت رِشی مُنی سے

(۳)

دوسرے جنم کی امید

فکروں کا الم
ادراک کا سَم

جذبوں کا ستم
احساس کا غم
ہوگا کچھ کم
شاید اُس دم
جب پائیں گے ہم
اک اور جنم

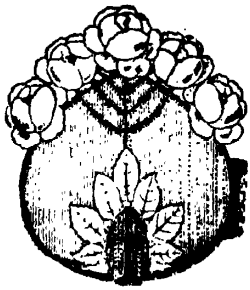
(۴)

قربت اور دوری

جذبۂ مذہب، سیاست کا خروش
علم کی جہدِ مسلسل، فن کا جوش
آدمی کی سمت ہے سب کا جھکاؤ
سب کو ہے انساں سے بنیادی لگاؤ
بات یہ ان سب کے ہے مدِّ نظر
آدمی سے ہوں سدا نزدیک تر
سب کو قربِ انسان کا منظور ہے
آدمی ہی آدمی سے دور ہے

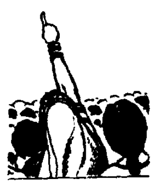
ظہیر غازی پوری

دو نظمیں



تیسری آنکھ

ہواؤں کی بیساکھیوں نے
کبھی دور تک ہم رکابی نہیں کی
مسافت میں اپنی
وہی تیسری آنکھ کھولو
کہ تم جس سے واقف نہیں ہو
مگر وہ تمہیں دیکھتی ہے
یہی وقت ہے
اس پہ ایمان لاؤ



ملبے میں دبا ہوا" میں"

میرے گھر پہ
تختی مرے نام کی ہے
مگر اس پہ لکھے ہوئے ہیں
کئی اور نام
اجنبی سے
جنھیں میں نہیں جانتا ——
وہ سب مجھے
میرے الفاظ میں ڈھونڈ لیں گے

ڈاکٹر نریش

میں اور تم

میں ، تم
یہ ، وہ
گو سب قسمت کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہیں
لیکن
میں کچھ تھوڑا بہت مختلف بھی ہوں
تم سب کچھ قسمت پر چھوڑ کر بیٹھ گئے ہو
میں حالات کی چکی میں پستا رہ کر بھی
سوچ رہا ہوں
غالب کبھی تو آجاؤں گا
ممکن نہیں کہ یوں ہی پستا رہوں عمر بھر
میرا ساہس ، میری ہمت
آخر کبھی تو رنگ لائے گی
صبر شکر کی بوسیدہ تعریف سے میں کچھ
باغی تو ہوں ۔

ڈاکٹر نریش

اُلجھن

میں جب خدا سے چلا تھا
تو اس نے مجھے ایک پیغام دیا تھا ۔
وہ پیغام تمہیں لوگوں کے لیے دیا تھا ۔
لیکن تم نے
بنا سُنے ہی
مجھ پر پتھر پھینکنے شروع کر دیے
تم اتنا چیخے چلّائے بلا وجہ
کہ میں کہتا بھی تو تم کیسے سُن سکتے تھے ۔
اب میں سوچ رہا ہوں
واپس جاؤں تو کون سامنہ لے کر جاؤں
خدا کہے گا میرا پیغام دیا کیوں نہیں

کیدار ناتھ کومل

چھوٹی نظمیں

صحیح الفاظ
روشنی کے بیج ہیں
دھرتی پر جہاں گریں گے
اُجالا پھوٹے گا!

ــ ــ

میں ایک عورت کو
جانتا ہوں۔ اُس کی
شکل میرے گیت کی
ہر سطر سے
ملتی ہے!

ــ ــ

دل میں آگ
آنکھوں میں دھواں ہے
زندگی
کتنی جواں ہے!

برسات
ہُوا
بادل؛
رُوپ
مہک
کاجل!

ــ ــ

پھُول
سپنوں کی
رنگین
دھُول!

ــ ــ

مہنگائی
بُوچڑ خانے میں
میمنے کی چیخوں پر

ہنستا قصائی !

سردی
چپڑاسی کی
ادھ پھٹی
وردی !

سورج اُگتا ہے تو
کھڑکی میں
روشنی کے پنچھی چہکتے گاتے ہیں
اور ہم
جنم جنم سے ریشمی
سپنوں میں اٹھلاتے ہیں !

ہر روز
چڑھتا ہوں لفظوں کی
اَن گنت سیڑھیاں
پھر بھی
سورج سے کوسوں
دُور ہوں !

تناظر۴

اُوپر، اوپر، اوپر اٹھو
مت اڑاؤ لفظوں کی دھول
سورج کی کھڑکی میں
کھلتے ہیں
جیون کے پھول !

پچھلا سال طوفان کی تیزی سا
بیت گیا، ہم
چیونٹی کی چال سے
چلتے رہے !
حالات کے پربت پہ
برف کی طرح
پگھلتے رہے !

آج نئے سال کا
نیا دن ہے
زندگی کی فائیل کے
پیلے کاغذات کو گلابی
فائیل کور پہنا دیں
ہم بھی زندہ ہیں
زمانے کو بتا دیں !

کرشن اشانت

منجمد جست

ان نظموں کا ترجمہ انوار رضوی
نے کرشن اشانت کے تعاون سے کیا

میں اپنے ڈرائنگ روم میں چپ چاپ بیٹھا
اک زمانے سے چپ چاپ بیٹھا
زندگی میں کچھ کر گزرنے کا منتظر ہوں

●●

سامنے کانچ کے شوکیس میں بند
برسوں پہلے خریدا۔ لکڑی کا گھوڑا
اپنی اگلی ٹانگیں اٹھائے
لمبی جست لگانے کے انداز میں کھڑا ہے

●●



سوچتا ہوں
بعض حالات میں
کانچ کی دیوار کو توڑنا اور پار کر جانا
کتنا مشکل ہوتا ہے

سلسلہ

آنکھیں میچ کر کاٹھ کے گھوڑوں پر بیٹھے لوگوں
کے پاس
دھوپ سینکنے کا وقت نہیں ہے

ان کے بچے نیم گرم ریت سے مٹھیاں بھر کر ہوا
میں اچھال رہے ہیں
سالہا سال گزر جاتے ہیں
لیکن سوار۔ گھوڑوں کی لگامیں نہیں کھینچتے
اور ریت سے کھیلتے کھیلتے بچے جوان ہو جاتے ہیں

●●

ایک مدت کے بعد
گھوڑ سوار اپنی آنکھیں کھولتے ہیں
دم بھر سستانے کو گھوڑوں سے اترتے ہیں
اور ---- اور ریت میں تحلیل ہو جاتے ہیں



●●

پھر ان کے جوان بچے
گھوڑوں پر چڑھنے کے لیے لپکتے ہیں
اور ان کے بچے
نیم گرم ریت سے مٹھیاں بھر بھر کر
ہوا میں اچھالنے لگتے ہیں۔

کرشن اشانت

نائیک

اب جبکہ میں
کرن کے ان کوچ کنڈلوں کے بارے میں سن چکا ہوں
جن کے ہوتے
اُس کی جان لینا ناممکن تھا

●

اب جبکہ میں
ارجن کے ان خیر خواہوں کو جانتا ہوں
جنہوں نے
ارجن کی ماں کو بھکاری کے لباس میں
وہ کوچ کنڈل سے مانگنے کے لیے دان ویر کے
پاس بھیجا تھا
اور وہ دان سورت چرا لائی تھی
کرن کی زندگی

●●

اب جبکہ میں
مریادا پرشوتم کے
اُس بازو کے بارے میں بھی سن چکا ہوں
جو رتھ کی دُھری ٹوٹنے پر
دُھری کی جگہ لگا دیا گیا تھا

●●●

ایسی حالت میں
کرن کی موت پر
ارجن کو جیت کا ہار پہنانا
مذاق سا لگتا ہے۔

●●●●

یہی وجہ ہے
کہ ہر بہادر کو دیکھ کر میری آنکھیں تلاش کرتی ہیں
اُس کی پشت پر کھڑے
اس مکار بھکاری کی یا مریادا توڑنے والے
اُس بازو کی
جو جسے چاہے، جب چاہے، جیسے چاہے
اُٹھا کر
نائیک بنا دیتا ہے۔

●●●●●

کرشن اشانت

پھپھوند

میں اپنے پاؤں تو آہنی بیڑیوں میں چھوڑ آیا تھا
چلوں تو کیسے

●

ڈر سے سہمے ہوئے لوگوں کا جلوس
مجھے اپنے کاندھوں پر اٹھا لیتا ہے
اور میری گردن
پھولوں کے بار تلے بل کھا جاتی ہے

●●

جوش ٹھنڈا ہونے پر جلوس منتشر ہو گیا ہے
اور وہ لوگ مجھے
فٹ پاتھ پر ایستادہ کر کے
کسی دوسرے سورما کی تلاش میں
چلے گئے ہیں

●●●

اب میں اپنی دلیری پر پشیمان ہوں
اور میری ٹانگوں میں اپنے پاؤں کو ڈھونڈنے کی سکت نہیں ہے
فٹ پاتھ پر برسوں یوں ہی کھڑے کھڑے
میرے سارے جسم کو
پھپھوند لگ گئی ہے۔

شاہد کلیم

گزیدگی

دفعتاً سرخ سورج نہ جانے کہاں
کون سے اونچے پربت کے پیچھے گرا
سارے رستے کہیں
دھند میں کھو گئے
شہر کے خوشنما اور دلکش مناظر
نگاہوں میں میری دھواں ہو گئے
طائروں کی چہک ، آدمی کی صدا
شور و غوغا کا یعنی ہر اک سلسلہ
آئینہ کی طرح ریزہ ریزہ ہوا
ریستوراں ، بار ، ہوٹل ، کلب
اونچے نیچے مکاں اور معبد سبھی
اوڑھ کر
بے صدا خامشی کی ردا سو گئے
چیخ کی گونج میری
کہیں بھی نہ بارِ سماعت بنی
سر پٹکتا رہا میں سیہ رات کے
آہنی بازوؤں میں پڑا

احمد رضی

اندیشہ

(کرشن موہن کی نذر)

میلا میلا
یہ پیلا پیلا سا اِک پیکر اِک سایا
روکھی، گہری ویراں آنکھیں
سوچ کے ناخن
فن کے رُخ پر آس کا غازہ
چہروں کی جانی انجانی آبادی، شہروں کی سڑکیں، چوراہے، دُکانیں کھونے اور کھو جانے کا اند
میرے جیسا کوئی گداگر اپنے فن کو قبروں میں لے جائے
اور قبروں میں نور بھرے
اُجلی اُجلی شامیں، سونے چاندی کے پر
خوابوں کی تعبیریں لے کر
اُس دنیا سے اِس دنیا میں
اِس آنگن سے اُس آنگن میں
اڑ اڑ جائے اڑ اڑ آئے

کنور سین

گوتم

اُس دن پہلی بار وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگیا۔
دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ غائب ہونے لگی۔ چہرے کی بشاشت مرجھانے لگی اور آنکھوں کی چمک ماند پڑنے لگی۔
مجھے اپنی طرف کھوجتی نظروں سے دیکھتے پاکر وہ چونک پڑا۔
کوئی خاص بات نہیں۔ بس یونہی۔ . .
لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بہہ نکلا:
دوسروں پر بیتی سُناتے زمانہ ہوگیا۔ آج اپنے پر بیتی سناؤں گا۔
اُس نے نگاہیں میرے چہرے پر ٹکا دیں۔
سُن رہے ہو؟ کوئی باہر دیوار سے لگا سِسک رہا ہے۔
مجھے حیرت میں ڈوبتے دیکھ بولا:
تم بے شک اسے میرا وہم کہو۔ مجھے لگتا ہے وہ دروازے پر دستک دینے کے لیے ہمّت بٹور رہا ہے۔ کاش وہ ایسا. . . . !
میں پریشان ہو اُٹھا۔ اُس دن پہلی بار میں نے اُسے اِس طرح بے چین ہوتے دیکھا تھا۔ نہ کمرے میں ہلچل تھی نہ باہر کوئی گڑبڑ۔ دونوں جگہ سُکوت طاری تھا۔ پھر اُسے کِسی کی سِسکیاں کیسے سنائی دینے لگیں۔ ٹھیک ہے کمرے کا دروازہ بند تھا۔

اندر سے سٹکنی چڑھی ہوئی تھی۔ ہم باہر کی نہیں جان سکتے تھے۔ پھر بھی ہمیں اتنا معلوم تھا کہ کمرے کے باہر تک پہنچنا تبھی ممکن تھا اگر برآمدے کا سیڑھیوں میں کھلنے والا دروازہ اندر سے بند نہ ہوتا۔

اسے باتیں کرنے کا شوق تھا۔ بند کمرے میں بیٹھ کر قصہ گوئی کا خبط۔ میرا اُس کے ساتھ خاص تعلق نہ تھا۔ بس راہ چلتے کی دُعا سلام۔ پھر بھی وہ مجھے مہینے میں ایک آدھ بار اپنے ہاں بُلائے جاتا۔ کھانے پینے کا سامان اندر دھر سٹکنی چڑھا دیتا۔ مجھے صوفے پر اپنے ساتھ بٹھا بنہ نہیں کہاں کہاں اور کِس کِس کی سُنانے لگتا۔ سناتے ہوئے مسکرانے لگتا۔ کبھی کبھار قہقہہ لگاتا جیسے وہ جو کچھ بتا رہا ہے اُس کے بارے میں اُس سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔

اکثر وہ آخری بات اس وقت ختم کرتا جب ہم اس کے گھر کی آخری سیڑھی اتر کر گلی میں آنے کو ہوتے۔ لیکن آج وہ کمرے میں ہی بولتے بولتے رُک گیا۔ اچانک خاموشی کے سمندر میں اُتر گیا۔ اُبھرا تو اس پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ آواز میں سے چہک اور لہجے میں سے لہک گُم۔

بات اتنی بڑی نہیں۔ میں تو خواہ مخواہ . . . .

اپنے کو ایک بار اور سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بتانے لگا۔

میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ ہاسٹل میں رہتا تھا۔ کالج شروع ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ لڑکے پڑھائی کی بجائے تفریح کرنے میں زیادہ مست تھے۔ ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے اور سمجھنے سمجھانے کا دور تھا۔ خالی پیریڈ میں شہر میں رہنے والے لڑکے اکثر ہمارے کمروں میں آجاتے۔ گپ لگاتے، ہنستے ہنساتے۔ یہاں وہاں کی سُناتے۔

بڑا لُطف تھا۔ ہم سب اپنے سے پرے کی خبر لاتے لیکن گو تم اپنے سے بھی

کم میں سمٹا رہتا۔ میری چارپائی کی پائینتی بیٹھا ہم سب کو سپاٹ نظروں سے دیکھتا رہتا شاید کچھ سوچتا رہتا۔

مٹیالے رنگ والا گوتم نہ خود کسی سے کھلتا نہ دوسروں کو اپنے سے کھلنے کے لیے اُکساتا۔ اگر میں جان بوجھ کر اُسے اپنی طرف نہ کھینچتا تو وہ میرے کمرے میں بھی نہ آتا۔ کالج کے باغیچے میں پیڑ کے نیچے بیٹھا کتاب پر جھکا رہتا۔

اُن دِنوں میں انیسواں پار کر رہا تھا۔ کھُلے ہاتھ پاؤں، کِھلتے رنگ، چوڑی پیشانی اور بھرے گالوں والا تنومند لڑکا۔ جوانی کی پہلی بوچھار میں بھیگتا ہوا۔ یہی لگتا رگوں میں دوڑتا لہو، جلترنگ چھیڑ رہا ہے۔ آس پاس مہک رہا ہے۔ میرے اندر بھی خوشبو اُٹھ رہی ہے۔ جی میں آتا سب کچھ آغوش میں سمیٹ کر سب کچھ میں ڈوب جاؤں۔

ایسی ہی مستی خیالات پر چھائی رہتی

وہ تڑپ اٹھا اور میرے شانوں کو پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا۔

کہاں معصوم خیالات کی پاکیزگی کہاں مجبور آدمی کے فعل! تم بھی تو جانتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے؟

اُسے اپنی وحشت پر قابو پانے میں کافی وقت لگا۔ کہانی کو آگے بڑھانے سے پہلے اُس نے کئی بار پہلو بدلا: اُس رات تک میں گوتم کو اتنا نہ جانتا تھا۔ اسے اپنی ہمدردی کا مستحق ضرور مانتا تھا۔ وہ مجھے خود اپنی دلجوئی کرنے سے بھی قاصر نظر آتا تھا۔

اُس رات وہ قریب نو بجے میرے پاس آیا۔ اس کے گھر اور میرے ہاسٹل کے درمیان آٹھ میل لمبا راستہ تھا۔ وہ راستہ اس نے ایک ہی دن میں سائیکل پر چار بار پار کیا۔

"راجن تم میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟" میں اس کے لہجے کی لجاجت پر پریشان ہو اُٹھا۔

"میرے گھر۔"

"کیوں؟"

"ماں نے تمھیں بلایا ہے۔"

اُس وقت؟

"اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرے سامنے کھڑا میرے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ عجیب حالت تھی۔ میں گوتم کو مزور جانتا تھا اُس کی ماں کا میرے ساتھ کوئی تعارف نہ تھا۔ تعارف ہوتا بھی تو میں کیا جان لیتا۔ میری عمر میں آدمی پاس بیٹھے لوگوں کو نہیں پہچانتا۔ اپنے سوائے کسی کو نہیں جانتا۔ یہاں معاملہ ہی اور تھا۔ اِدھر میری نادانی اُدھر سامنے کھڑے گوتم کے چہرے پر پھیلی لجاجت بھری معصومیت۔

"ہاسٹل کا گیٹ نہ بند ہو جائے۔"

گوتم کی آوز میں لرزتی بے چینی نے مجھے چونکا دیا۔

نومبر کی آخری رات تھی۔ کافی خُنک۔ میں گوتم کی سائیکل پر آگے بیٹھا تھا۔ وہ اسے چلاتا ہوا ہانپ رہا تھا۔ میں خیالوں میں ڈوبا کانپ رہا تھا۔ بار بار میں اُس سے اُس کی ماں اور گھر کے بارے میں پُوچھتا۔ وہ کوئی جواب نہ دیتا۔ سائیکل ہانکے جاتا۔ تھک ہار کر میں اُس کی ماں کے بارے میں اندازہ لگانے لگا۔

میری اپنی ماں جیسی بال بچّے دار عورت۔ نہ جسم کی پروا نہ لباس کا ہوش۔ ایک ہاتھ رسوئی میں دُوسرا غسل خانے میں۔ میرے دوستوں کو دُعائیں دینے والی اسی بہانے میرے لیے دُعائیں سمیٹنے والی۔ کسی انہونی کے ہو جانے کے اندیشے سے نڈھال اپنے مرد اور بچوں کی فکر میں جاگنے اور سونے والی۔

لیکن میری ماں نے مجھے کبھی کسی جانے انجانے دوست کو دن میں یا رات گئے بُلا کر گھر لانے کو نہیں کہا۔ یہ سوچتے ہی میں بے چین ہو اُٹھتا اور میرے کانوں میں گوتم کی مُرجھائی ہوئی آواز پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اُترنے لگتی۔

ماں نے تمھیں بُلایا ہے

اُس آواز کو سُنتا ہوا میں ایک ایسی عورت کو نمسکار کرنے کے لیے تیار ہونے لگتا جس نے مجھے اتنی رات گئے محض اس لیے بلا بھیجا کہ میں اس کے بیٹے کا ہم جماعت تھا۔

ذرا رُک کر راجن نے پھر کان کھڑے کر لیے اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں تمھیں کیا بتانے والا ہوں۔

گوتم کے گھر پہنچ کر یُوں ہی میں نے ڈرائنگ رُوم میں قدم رکھا میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ میرے لیے دہلیز سے آگے بڑھنا مشکل ہو گیا۔ اُس سرد رات میں میرا ماتھا پسینے سے بھر گیا۔ تبھی وہ عورت کمرے کے وسط سے آگے بڑھی اور مجھے بازو سے پکڑ کر صوفے کی طرف لے چلی۔

ہڑبڑا کر میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ کواڑ بند تھے۔

راجن سہم گیا:

سچ کہتا ہوں مجھے لگا نہ میں اُٹھ کر باہر جا سکتا ہوں نہ وہاں بیٹھا رہ سکتا ہوں۔

وہ رات مجھے کبھی نہیں بھولی۔ ہمیشہ میرے اندر سفر کرتی رہی۔ شاید اُس رات کا قصہ سنانے کے لیے ہی میں اتنے دنوں تک تمھیں جگ بیتی سناتا رہا۔ مجھے یہی لگتا رہا تم میری بات کا یقین نہیں کرو گے۔ اُسے کوری گپ سمجھ کر مُسکرا دو گے۔ لیکن میں اور انتظار نہیں کر سکتا۔ اتنا ضرور کہتا ہوں کہ میں جو کچھ بتانے والا ہوں اُس میں رتی بھر جھوٹ نہیں ہے۔

وہ دھاگے کا سرا ڈھونڈنے لگا۔

گوتم کی ماں کا نام چندریکا تھا۔

کیا تم نے دُوج کا چاند اپنے من کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ پُورنماشی کے چا
کی کھِلتی معصومیت تم سے چھُپی نہ ہو گی۔ شاید تم نے گلاب کی پنکھڑیوں کی کنواری
ملاحت کو اپنے اندر اُترتے محسوس کیا ہو یا صبح کی پہلی کرن کو شبنم کی بُوند کی آغو
میں مچلتے ....

میں نہیں بتا سکتا۔ دُنیا کا کوئی بھی انسان نہیں بتا سکتا چندریکا کیسی تھی
کھُلے ہوئے نُور کی مورت اپنے میں مچلتی دھنک کو خود بھی نہیں پہچان پاتی۔ مجھے یقی
ہے اگر بتّی بجھا دی جاتی تو بھی چندریکا کا سراپا دمکتا رہتا۔ تم ہی بتاؤ خالص حُسن
لفظوں میں ڈھالنا ممکن ہے؟۔

راحن نے آہ بھری :

بے شک میں چندریکا کے بارے میں سب کچھ بتاؤں گا لیکن کہانی اس کی نہ
گوتم کی ہے۔ اُس رات کے ڈرامے اور اس کے بعد ہونے والے سانحہ کا مرکز
کردار وہی ہے۔ اُس رات بھی وہ باہر کھڑا دروازے......... شاید میں اُس
رات بھی وہم کا شکار تھا لیکن گوتم .....

میں کہہ چکا ہوں کہ میں اس رات کو نہیں بھول سکتا۔

تم نے یہ تو نہیں سوچ لیا کہ میں آخر میں یہ کہہ کر معاملہ ختم کر دوں گا کہ
چندریکا گوتم کی ماں نہیں تھی۔ میں تو یہ بتانے والا ہوں کہ گوتم کے علاوہ اُس کے
تین بچے اور تھے۔ گوتم اُن تینوں سے بڑا تھا۔

کوئی بھی عورت ماں بننے کے بعد اپنی دوشیزگی کا کچا نِکھار بنائے نہیں رکھ سک
لیکن چندریکا، ایسی عورت تھی جو پوری کائنات کو جنم دے کر بھی اپنی تازگی اور
رعنائی کو رتّی بھر مدھم نہ ہونے دیتی۔ ایسی عورت کی عمر کا تعیّن نہیں ہو سکتا کہ وہ وق

کے اثر سے باہر ہوتی ہے۔

چندریکا ایسی ہی تھی۔ دراصل میں نے اس کے بارے میں زیادہ نہیں بتایا کہ بتانے سے بات بگڑتی ہے اور محدود ہو جاتی ہے۔ یوں بھی میرا مقصد چندریکا کے مکمل اور لازوال حُسن کو بیان کرنا نہیں۔ میں تو گوتم.......

راجن جُملے کو ادھورا چھوڑ کر کہانی کی طرف لوٹا:

جلد ہی میں نے محسوس کیا میں گوتم اور اپنے کو بھُول کر چندریکا کو دیکھنے لگا ہوں۔ وہ میرے سامنے بیٹھی اپنی پُراسرار مسکراہٹ ایک طرف دھرے پتہ نہیں کہاں کھو گئی تھی۔ اچانک وہ بے چین ہو اٹھی اور اُس نے اپنی آنکھوں میں امڑتا اضطراب میرے وجود میں سمونا شروع کر دیا۔ حُسن کو اُداس اِضطرار کا مہین پردہ اوڑھتے دیکھنا اور اس سے بچ سکنا!

مجھے الجھن میں پڑتے دیکھ چندریکا نے اپنے کو سمیٹا اور بولی:

گوتم میرا بیٹا ہے۔ اُس کی مٹ میلی صورت اور بجھی بجھی سیرت سے کوئی بھی دھوکا کھا سکتا ہے۔ دراصل وہ مجھ سے زیادہ اپنے باپ کی اولاد ہے۔

تم لیٹ جاؤ

مجھے اشتیاق بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے چندریکا اٹھی اور میری طرف بڑھنے لگی۔

اِس کے بعد جو کچھ ہوا وہ خواب جیسا تھا۔

میں لیٹا ہوا تھا۔ چندریکا میرا سر اپنی گود میں رکھے میرے بالوں کو سہلا رہی تھی۔ وہ بار بار جُھکتی اور میری پیشانی چومنے لگتی۔ اپنی کہانی سناتے ہوئے وہ میرے اندر اُترتی جاتی.....

گوتم کا باپ اینٹوں کا بھٹہ لگاتا۔ بڑی بڑی مونچھوں اور کھُردرے چہرے والا

پگڑ دھاری ۔ ذات تو ذات بات میں بھی رس نہ تھا۔ ہر لحاظ سے زیادہ پکی اینٹ جیسا سہاگ رات کو میرا گھونگھٹ اٹھاتے ہی بڑبڑانے لگا۔

بے شک تو موہن کے ساتھ ہی سجتی لیکن اب ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ اب تو . . . .

چندریکا میرے ہونٹوں کو چومنے لگی۔

تم عورت کے انگ انگ کو آنک سکتے ہو۔ مرد ہونے کے کارن مردانہ حُسن نہیں پہچان سکتے۔ میلے دانتوں، کالے ہونٹوں اور بے ڈھب جُثے میں بھی ایک وجاہت ہوتی ہے۔ بات کرنے کی وجاہت ——— گوتم کے باپ میں وہ نہ تھی ورنہ وہ سہاگ رات کو ایسا نہ کہتا ——— چاہت اور عشق کا وقار کسی کسی کو میسّر آتا ہے ۔

چندریکا تڑپ اٹھی :

ٹھیک ہے میں موہن سے محبّت کرتی تھی۔ گوتم کا باپ ہی نہیں سارا شہر یہ بات جانتا تھا۔ پھر اسے کیا پڑی تھی کہ . . . . تبھی تو شادی کے بعد میں بچے اُس کے جنتی رہی دم موہن کا بھرتی رہی ۔

گوتم کا باپ اپنی غلطی بہت دیر بعد سمجھا۔ اُس نے میرے دل سے موہن کا خیال نکالنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ آخر اُس نے اپنا سب کچھ ایک رات میں مجھ پر نچھاور کرنے کا سوچ لیا :

چندریکا ! آج رات میں تمھارے لیے چاندی کا فرش اور سونے کا بستر بچھاؤں گا۔

میری طرف دیکھتا ہوا وہ مجھ سے میری آتما مانگنے لگا۔

رات ہوئی ۔ میں برآمدے میں بچھے چاندی کے سکّوں پر چل کر کمرے میں پہنچی ۔ پلنگ پر اشرفیاں بچھی تھیں ۔ اِس سے پہلے کہ میں پلنگ پر بیٹھوں میرے اندر ڈیوڑھی کے دروازے کی زنجیر کھٹکنے کی آواز گونج اُٹھی :

"موہن!" میں اندر ہی اندر چلاّئی اور اُلٹے پاؤں برآمدہ پار کرنے لگی۔
ڈیوڑھی کا دروازہ بند تھا۔ اُسے کھول کر دیکھا باہر گلی سنسان تھی۔
پتہ نہیں میں کتنی دیر تک باہر پھیلی ویرانی کو دیکھتی رہی۔ لوٹ کر کمرے میں گئی تو گوتم کا باپ اشرفیوں پر چت لیٹا ہُوا تھا۔ اُس کے منہ سے جھاگ اُبل رہی تھی۔ اس نے زہر کھا لیا تھا۔

چندریکا کراہ اُٹھی

میں جھوٹ کیوں بولوں۔ گوتم اور تینوں دوسرے بچے اپنے باپ کی لاش کو دیکھ رہے تھے۔ گوتم بات کو سمجھتا تھا۔ وہ اُداس تھا۔ باقی تینوں پریشان سے تھے۔ میں نہ خوش تھی نہ اُداس۔ وہ وقت تھا جب گوتم نے میرے بے نیاز چہرے پر ذرا دیر کو نگاہیں ٹکائیں اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

چندریکا کو بھول کر ایک لمحے کے لیے میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ کواڑ بدستور بند تھے۔ مجھے لگا باہر کھڑا کوئی سسک رہا ہے بالکل ویسے ہی جیسے آج۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اُس رات مجھ پر جو بیتی میں اسے لفظوں میں نہیں ڈھال سکتا۔ چندریکا تڑپتی رہی۔ سسکتی رہی۔ سُبکتی رہی۔ میرے ساتھ جو جی میں آیا کرتی رہی۔ گوتم کے باپ کی موت کے بعد موہن کے ساتھ اپنے تعلقات کا قصّہ سُناتی رہی۔ میں ایک طرف اندیشے سے بھرتا گیا دوسری طرف لذّت۔ ۔ ۔ ۔ ۔

چندریکا سناتی چلی گئی۔

گوتم کے باپ کی موت کے بعد میں نے دُنیا کو ایک طرف دھر موہن کو اپنا لیا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اولاد بھی تھی۔ لیکن اُس نے اپنی بیوی اور مجھے دونوں کو سنبھال لیا۔ ہفتے کے چار دِن وہ اپنی بیوی کے ساتھ گزارتا۔ تین دن میرے

ساتھ ۔اُسے پیسے کی کمی نہ تھی۔ جس مجسٹریٹ کا وہ ناظر تھا وہ اُس سے مِل کر موٹی رشوت کھاتا۔ اپنا اور موہن کا کام چلاتا

چندریکا نے یکایک اپنے کو مجھ سے الگ کرلیا۔

آج میں کہتی ہوں سوائے اپنے خاوند کے دوسرا کوئی آدمی کامل مرد نہیں ہوتا۔

مجھے آنکھیں پھاڑے اپنی طرف دیکھتے پاکر وہ چیخی:

بے شک میں اپنی کہی ہوئی کو رد کر رہی ہوں لیکن میں کیا کروں۔ موہن نے پچھلے ہفتے . . . . .

چندریکا نے اپنی شال میرے ننگے جسم پر ڈال دی:

پچھلے ہفتے موہن مجسٹریٹ کو یہاں لے آیا۔ دونوں دیر تک شراب پیتے رہے۔ اچانک مجسٹریٹ کی نگاہیں میرے جسم کو ٹٹولنے لگیں۔ موہن نے نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔ اگلے ہی پل مجسٹریٹ میری طرف لپکا لیکن میں......

چندریکا نے شال کھینچ لی اور میرے جسم کو دیکھتی ہوئی مجھ سے دوبارہ لپٹ گئی۔

اسی وقت کواڑ کھلنے کی آواز آئی۔ بھاری قدموں سے چلتا ہُوا ایک آدمی ہمارے سامنے آکھڑا ہوا۔

چندریکا اور موہن کو ڈرائنگ روم میں چھوڑ میں باہر نکلا تو میرے رہے سہے ہوش بھی جاتے رہے۔ میں نے دیکھا پو پھٹ رہی تھی۔ گوتم سائیکل تھامے گیٹ پر کھڑا تھا۔ وہی مٹیالا چہرہ، بے نور سی آنکھیں، جُھکا ہوا وجود جیسے ابھی ابھی سسک بند کرکے میرا انتظار کرنے لگا ہو۔

راجن تلملا اُٹھا۔

میں تمھیں یہ نہیں بتانا چاہتا کہ چندریکا نے یہ ناٹک کیوں کیا۔ یہ سب تم خود بھی جان سکتے ہو۔ یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ عورت کو کوئی نہیں جان سکتا یا کہ عورت ہوتی

ہی ایسی ہے۔ ان باتوں یا دعووں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ میرا تعلق گوتم سے ہے جو آئندہ بھی مجھے لینے میرے ہاسٹل آتا رہا۔ وہی رات گئے۔ اسی ناٹک کے لیے۔ ڈراپ سین بھی نہیں بدلا۔ آغاز اور درمیان کا عمل بھی ویسا ہی رہا۔ لیکن اس کھیل میں میری مرضی کو کتنا دخل تھا۔ اِس بات کا فیصلہ میں نہیں کر سکا۔ گوتم جب بھی آتا میں کانپ اٹھتا۔ وہ بہت دنوں تک نہ آتا تو میں بے چین ہو جاتا۔

سب سے عجیب بات یہ تھی کہ کالج میں پڑھائی کے درمیان گوتم کو میں نے کسی طرح سے بھی میرے اور اپنی ماں کے تعلقات کے بارے میں سوچتے نہیں پایا۔ وہی گھٹی گھٹی، بجھی بجھی شخصیت۔ نہ ندامت کا احساس نہ خفّت بھرا غصّہ۔ پھر بھی مجھے لگتا رہتا وہ ڈرائنگ روم کے کواڑوں سے ٹکا سِسکتا رہتا ہے۔ سُبکتا رہتا ہے۔ انھیں کھول کر اندر آنے کی ہمّت بٹورتا رہتا ہے۔

فائینل امتحان کا نتیجہ نکلا۔ میں فیل تھا۔ گوتم اعلا نمبروں سے پاس۔ مجھے نتیجے کا علم تھا۔ میں پڑھائی چھوڑ کر قصبے کو لوٹ گیا۔ اپنے والد کے بزنس میں کھپ گیا۔ اُسے ترقی دینے کے لیے اُس کی ایک شاخ دِلّی میں کھولنے کا منصوبہ پورا کرنے میں جُٹ گیا۔ گوتم اور اس کی ماں کو بھولنے کی لگاتار کوشش کرتا رہا۔ پھر بھی کسی نہ کسی بہانے مجھے گوتم کی خبر مِلتی رہی۔

وہ ذہین تھا۔ دُھن کا پکّا تھا۔ خجالت جھاڑ کر اپنی راہ چلنے والا۔ ندامت، خفّت، کسرِ نفسی کو پرے دھکیل اپنے کام میں کھو جانے والا۔ اس نے ایم۔اے میں امتیازی پوزیشن حاصل کی اور اپنے ہی کالج میں لیکچرار ہو گیا پھر میں نے سنا وہ پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے بعد امریکہ چلا گیا۔ وہاں ایک یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر کے عہدے پر فائز ہو گیا۔

چندریکا کے بارے میں میں زیادہ نہ جان سکا۔ لیکن اس کے متعلق میری عجیب

حالت تھی۔ میں اسے بھولنے کی کوشش کرتا وہ مجھے یاد آتی رہتی۔ اُس کے پاس جانے سے ڈرتا رہتا اُسے پانے کے لیے بے قرار ہو اٹھتا ایک بات کا مجھے یقین تھا۔ وہ اب بھی اُتنی ہی جوان اور حسین ہو گی۔ سُر کیے ہوئے ستار جیسی۔ یہی بات مجھے ڈراتی تھی۔ یہی بات مجھے اُس کی طرف کھینچتی تھی۔ میرے لیے وہ ایک پُر اثر اور غیبی ہستی تھی۔

راجن خاموش ہو گیا اور اُس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں لرز گیا۔ ان آنکھوں میں بے پناہ مایوسی تھی۔

"راجن!" اُس کی کہانی کو من ہی من میں دُہراتے ہوئے میں نے اپنے کو سنبھالنے کی خاطر اُسے آواز دی۔

میری آواز کو اَن سُنا کر کے وہ دیر تک گُم سُم بیٹھا رہنے کے بعد کراہ اُٹھا:

کہانی کیسی بھی ہو اُس کا کوئی بھی کردار ہونی کے ہاتھوں . . . . .

میں دِلّی میں بس گیا تھا۔ بزنس جوبن پر تھا۔ یہ کوٹھی میں نے یہیں کی کمائی سے بنوائی۔

ایک شام کناٹ پلیس میں مجھے کالج کے دِنوں کا ایک اور دوست گپتا مل گیا۔ میں نے اُسے نہیں پہچانا۔ وہی مجھے کار میں بیٹھنے سے روک کر میرے ساتھ لپٹ گیا:

"راجن! تم مجھے بھول گئے لیکن گوتم کو تو نہیں بھولے ہو گے!"

میں نے پھر بھی گُپتا کو نہیں پہچانا لیکن اُسے اپنے ساتھ بٹھا کر یہاں لے آیا۔

گُپتا نے مجھے بتایا گوتم امریکہ میں کام ختم کر کے لوٹ آیا ہے۔ وہ آج کل چنڈی گڑھ میں پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔ اُس کی بیوی امریکن ہے۔ اب اُس کا حُلیہ وہ نہیں رہا۔ نہ چہرے پر ندامت کا پتہ چلتا ہے نہ لہجے میں لجاجت کا۔ اب اُس کی آواز میں ایک کھنک ہے اور لہجے میں ایک ٹنکار۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی گوتم

ہے جو کالج میں دوسروں کو ہنستے، مذاق کرتے دیکھ اپنے ناخن چبانے لگتا تھا۔ پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدتا ہوا اپنے پرچھائی حفت مٹانے لگتا تھا۔ اب وہ ایک پُر فضا انسان ہے۔ اپنی امریکن بیوی کے ساتھ خوبصورت اور پُرسکون زندگی کرنیوالا۔ آزاد اور کھُلی سوسائٹی کا دلدادہ۔

گپتا چلا گیا۔ میں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ گوتم سے ملنے، اس میں آئے اعتماد کو دیکھنے کے لیے چنڈی گڑھ جانے کی تیاری۔

چنڈی گڑھ پہنچتے پہنچتے بیتی ہوئی زندگی کا ایک ایک منظر لاتعداد بار میری نظروں کے سامنے آیا اور میرے من نے مجھے بہت کچھ سمجھایا۔ ایک بھی بات ایسی منہ سے نہ نکالنا جس کو سن کر گوتم کی نظر نیچی ہو جائے۔ ایک بھی حرکت ایسی نہ کرنا جو گوتم کو ماضی کے اژدہے کے منہ میں دھکیل دے۔ جو کچھ گوتم نے حاصل کیا ہے اُس کا احساس بنائے رکھنا۔ اُس کی بیوی کے سامنے اُس کی شخصیت کو اور بھی اُجاگر کرنا۔ اُسے بس یہی لگے کہ دو بہت گہرے دوست ایک عرصے بعد ایک دوسرے سے ملے ہیں۔ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کو محبّت کرتے رہے۔ ایک دوسرے کا احترام کرتے رہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ مساوی سلوک کرتے رہے۔ جہاں تک کہ گوتم علم میں عقل میں مجھ سے آگے ہے۔ میں اُس کے آگے کئی لحاظ سے کمزور ہوں.... سب کچھ بتانا، سب کچھ سننا چندریکا کو یاد نہ کرنا۔ اُس کا ذکر زبان پر نہ لانا۔ گوتم کی بیوی کو ایک ہی بات جتانا ـــــ گوتم دنیا کا بہترین انسان ہے۔ بہترین دوست...

میں نے کار گوتم کے بنگلے کے سامنے کھڑی کی تو رات کے نو بج چکے تھے۔ گھنٹی کی آواز سن کر نوکر نے دروازہ کھولا اور میرا نام اور مقام پوچھ کر اندر چلا گیا۔ ایک منٹ بعد دُودھیا رنگ کی پری چہرہ عورت ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرے دروازے پر نمودار ہوئی اور انگریزی میں بولی:

"گوتم گھر پر نہیں ہے۔ وہ فیکلٹی کی میٹنگ میں ہے۔ آپ کا سواگت ہے۔"
ورجنیا مجھے اندر لے گئی۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی ہم بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ میں اُسے گوتم کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ مجھے اس کے ساتھ اپنی محبّت اور شادی کا قصّہ سنانے لگی۔ اچانک وہ اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

"سردی بڑھ گئی ہے۔ میں دروازہ بند کر دوں۔"

اس کے ایسا کہتے ہی میرے اندر ایک برفیلی لہر دوڑ گئی۔ میں نے چاہا میں اُسے روک دوں بیٹھ جانے کو کہوں لیکن میں کچھ نہ بول سکا۔ وہ کواڑ بند کر کے لوٹ اور بڑے چاؤ سے میرے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ گوتم کے ذکر پر وہ کھِل اُٹھتی اور کئی بار میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دبانے لگتی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ ایک امریکی معاشرے میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی لڑکی اپنے شوہر سے اس قدر محبّت کر سکتی ہے اُس کے ذکر پر والہانہ داد دے سکتی ہے۔ جھُوم جھوم کر اپنی مسرّت کا اظہار کر سکتی ہے۔

راجن پھر بے چین ہو اُٹھا:

یوں یوں وقت گزرتا گیا میں بے چین ہوتا گیا۔ ورجنیا میری باتوں کو سن کر اور بھی بے تاب ہوتی گئی۔ مجھے لگا وہ گوتم کے آتے ہی چلّا اٹھے گی:

او گوتم! تم کتنے عظیم ہو۔ کاش میں یہ سب۔۔۔

میرے من کے چور نے مجھے بہت سمجھایا، ڈرایا دھمکایا لیکن میں ورجنیا کو سرد مہری سے اپنے سے پرے نہ دھکیل سکا۔ تکلّف اور آداب کا تقاضا مجھ پر حاوی ہو گیا۔ مجھے یہ خیال بھی بار بار آیا کہ گوتم اور ورجنیا ایک دوسرے کو پوری طرح جان گئے ہوں گے۔ گوتم اس کی پُر تکلّف بے تکلّفی کو برداشت کرنا کب کا سیکھ چکا ہو گا امریکہ

سے آئی اپنی بیوی کی تہذیب . . . .

اُسی وقت ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر گوتم اندر داخل ہُوا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ دہلیز کے قریب رُک کر مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ میری توقع کے خلاف نہ ورجنیا اٹھ کر اُس کی طرف لپکی نہ اُسے دیکھ کر چلّائی۔ میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے مسکراتی رہی۔

گوتم کے چہرے پر چھائی بشاشت اور سکون تیزی سے غائب ہونے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے پر جانی پہچانی ندامت، خفت اور شکست کا احساس اُبھرنے لگا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر میں دہشت سے بھرنے لگا۔ میرے جی میں آئی۔ ورجنیا سے اپنے ہاتھ چھڑا کر گوتم کی طرف لپکوں اور اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لوں لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ تبھی اُس کی آنکھوں سے بے زار بے بسی ٹپکنے لگی اور اُس کے ہونٹ لٹک گئے۔

اس سے پہلے کہ ورجینیا اس کی بدلتی ہوئی حالت کو پوری طرح سمجھ سکتی گوتم مُڑا اور تیزی سے قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل اپنے پیچھے دروازہ بند کر گیا۔



شوکت حیات

روزمرّہ

جنازہ قبرستان کے قریب پہنچ چکا ہے۔
لوگ خوش آمدید کہہ رہے ہیں
پوسٹ مارٹم رپورٹ اربوں ہاتھوں میں پہنچ کر پرزہ پرزہ ہو چکی ہے۔
لوگ کورے کاغذ کی دھجیاں اڑا رہے ہیں اور خود ہی لوٹ رہے ہیں۔ پورا احتمال ہے کہ اڑاتے لوٹتے کوئی نہ کوئی سڑک کے بیچوں بیچ کسی گاڑی کے نیچے آجائے گا۔ دب کر کچل جائے گا۔ پھر تمام کورے کاغذ کے پرزے اڑانے اور لوٹنے کا مشغلہ چھوڑ کر کچلے ہوئے آدمی کو مارنا شروع کر دیں گے۔

—— بے ہودے .... ایسی بھی لاپروائی ....

اور پھر گاڑی والے سے کچلے ہوئے آدمی کی لاپروائی کے لیے معافی مانگیں گے۔ اس کی خوشامد کریں گے۔ موٹر والے کے چلے جانے کے بعد بغیر پوچھے ہوئے ایک دوسرے سے سوال کریں گے اور بغیر سنے ہوئے جواب دیں گے —— پورا احتمال ہے کہ اس کے بعد آبدیدہ ہو کر پھر کورے کاغذ کے پرزے اڑانے اور لوٹ کر جیب میں رکھنے کے لاحاصل شغل میں مصروف ہو جائیں گے۔

ایک آدمی بہت دیر سے ادھ جلی بیڑی، سگریٹ اور بدبوؤں کے درمیان بے نتیجہ معلق اکڑوں بیٹھا ہے۔ باہر" حرامی، حرامزادے اور کتے" بڑبڑاتی ہوئی بھیڑ دروازہ

بیٹ رہی ہے۔ کچھ ہی دیر میں دروازہ ٹوٹ جائے گا۔ لوگ اسے کالر سے پکڑ کر کھینچیں گے اور پھر تمام باہر والے اندر جانے کے لیے ایک دوسرے سے متصادم ہوجائیں گے کئی گھنٹوں یعنی کئی صدیوں تک ایک دوسرے پر وار کریں گے۔ پھر رونے لگیں گے۔

آنکھیں سوتی ہوئی بھی گھور رہی ہیں۔ لب ہلے بغیر چیخ رہے ہیں۔ کان بجے بغیر سن رہے ہیں۔ ہاتھ پیر دوڑے بغیر ہانپ رہے ہیں۔ آنکھیں سوتی ہوئی بھی پھٹ رہی ہیں۔ خواب میں اپنے بکھرے ہوئے عضو جوڑ رہی ہیں۔ صبح ہوتے ہی یہ لوگ اپنے آپ کو بکھیر دیں گے۔ اور بکھرے ہوئے ٹکڑوں میں سے کسی ایک کو تمام دن توڑیں گے اور شام سے پہلے انھیں بھی بکھیر دیں گے۔ رات ڈھلتے ہوئے ڈیرے کی تلاش شروع کر دیں گے اور مرتے دم تک گھر نہیں پہنچیں گے۔ تکان سے دب کر راستے ہی میں کہیں رک جائیں گے۔ جانے پہچانے چہرے (ماں، بیوی، بہن، بھائی کسی کا بھی یا سب کا ہو سکتا ہے) ٹمٹماتی ہوئی آنکھوں سے گھورتے ہوئے قریب آئیں گے۔ ان چہروں کے درمیان پسینے کی دیواریں تن جائیں گی۔ آنکھوں کے سامنے دھندلکا چھا جائے گا۔ اندوہناک گھٹن غصہ میں تبدیل ہو گی اور یہ اپنا چہرہ بھنبوڑنا شروع کر دیں گے۔ وقفہ کے بعد کچھ دیر کے لیے شاید سو جائیں خواب دیکھیں اور اپنے آپ کو جوڑیں اور صبح ہوتے ہی روزانہ کی طرح خود کو بکھیر کر چہار سمتوں میں روانہ ہونے پر مجبور ہو جائیں۔

روٹی صدیوں سے آدمی کو کھا رہی ہے۔ آج تک کوئی ایسی روٹی تخلیق نہیں ہوئی جس کو آدمی نے کھایا۔ روٹی، روٹی خشک آنکھوں سے پستانوں کو نگل رہا ہے۔ مزہ لے لے کر سی سی کر رہا ہے۔ نگلتے نگلتے دانت گڑا دے گا۔ بھری پری تکیہ کو مسمار کرے گا اور آنکھوں سے روٹیاں پگھل کر ٹپکنے لگیں گی تو روتا ہوا بڑبڑائے گا۔

—— دو سو ساٹھ کے اسکیل میں شادی کروں گا...... خودکشی نہیں کرلوں گا........!

پھر حشیش خریدے گا۔ دم لگا کر ڈگمگائے گا اور فقیروں کو ہاتھوں سے اور وزیروں کو جوتوں سے سلام کرے گا۔

جگ مگ دکانوں میں رات دن سے زیادہ روشن ہے۔ عقب میں دن رات سے تاریک ہے باہر باہر چاروں طرف دیکھ رہا ہے۔ اپنے اندر انھیں جھانک رہا ہے لازوال سناٹے کو نہیں پکڑ رہا ہے۔ چپ چاپ شور کر رہا ہے۔ چپ چاپ ٹھنڈی آگ لگا رہا ہے۔ بارش کی دعائیں کر رہا ہے۔ پانی برسے گا تو کہے گا۔

مجھے قحط میں روٹی کے بغیر مرنا پسند ہے لیکن بارش نہیں!

اپنے جسم کو اچھالے گا، خود کھڑا رہے گا۔ خود کو نچائے گا اور جسم کو ساکت رکھے گا۔ اپنے آپ کو اوپر بھیجے گا اور خود نچلی سیڑھی پکڑے رہے گا۔ بیڑی پیے گا اور سگریٹ کی مدح کرے گا۔ سگریٹ اور شراب کے ساتھ اختلاط کرے گا۔ بھائی کو مارے گا اور دشمن کو بھائی کہے گا۔

خالی ہو جاؤ تو سب جان جاؤ گے۔ سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔ اگر خود سے مہلت ملی۔ تمھاری ناکہ بندی نہیں ہوئی۔ بچ کر نکلے تب تو خالی ہو سکو گے اور خالی ہو سکے تب تو جان پاؤ گے۔ جان پاؤ گے تبھی تو آسمان کی قبر تیار کرو گے۔ آسمان کا کفن پہنو گے اور آسمان کی نیند سوؤ گے۔

درزیوں کے یہاں کھونٹیوں پر سوٹ کے بجائے آدمی ٹنگے ہیں۔ کھلونوں کی دکانوں کے شوکیش میں بچے پیٹ پکڑے بیٹھے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ ان کی ہنسی کے لعاب سے نت نئے کھلونے تیار ہو رہے ہیں۔ خریدار بوڑھے ہیں۔ تین پہیوں والی چھوٹی سائیکلوں پر بیٹھے ہیں۔ انھیں توڑتے ہیں اور نئی سائیکل خریدتے ہیں۔ پھر انھیں توڑتے ہیں۔ آخر میں ان کے پیسے ختم ہو جائیں گے اور وہ اپنی چھڑی کو سائیکل بنائیں گے اور چھڑی ٹوٹ جائے گی تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بچوں کی طرف

دیکھیں گے۔ پیٹ پکڑ کر ہنستے ہوئے بچے اب بھی روئیں گے نہیں۔

آدمی بیک وقت رو رہا ہے اور ہنس رہا ہے۔ روتے ہنستے بار بار گھڑی دیکھتا ہوا باتیں کر رہا ہے اور کھا رہا ہے۔ پھر کھانا چھوڑ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اپنے کچے ڈیرے سے نکلتا ہے اور سامنے کی کئی منزلہ اسکائی اسکریپر کے نچلے دروازے پر تالہ لگا دیتا ہے۔ اور جب اوپری منزلوں کے چھجّوں پر گردنوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے تو بولتا ہے۔

اب آؤ سالو نیچے .... !

رہو اوپر کتّو ....!

نیچے والوں سے تمھارا کوئی رشتہ نہیں .... !

خبردار حرامزادو .... !

پھر رونا ہنسنا شروع کرتا ہے۔ پورا احتمال ہے کہ کچھ دیر بعد وہ خاموش ہو جائے گا۔ گھڑی دیکھتے دیکھتے اسے جھٹکے سے کھینچ کر زوروں سے سڑک کے کنارے پھینک دے گا۔ کلائی سے رستے ہوئے خون کو چوسے گا اور پھر "انقلاب" "انقلاب" کے نعرے لگاتا ہوا سڑکوں کے چکر کاٹے گا۔

آدمی جیب میں ہاتھ ڈال رہا ہے۔ نکال رہا ہے۔ شیلف میں ہاتھ ڈال رہا ہے نکال رہا ہے۔ جیب خالی ہے۔ شیلف خالی ہے۔ پھر بھی وہ ہاتھ ڈال رہا ہے۔ اور اب وہ بیٹھ جائے گا لڑھک جائے گا۔ سونے کی کوشش کرے گا۔ اٹھ کر بیٹھے گا۔ پھر سونے کی کوشش کرے گا۔ پھر اٹھے گا اور کمرے کے اندر ٹہلنا شروع کر دے گا۔ ٹہلتے ٹہلتے پیر پٹکنے لگے گا۔ بند کمرہ چیخنے لگے گا۔ اس کی گردن دبوچنے لگے گا۔ ہانپتے ہوئے اچانک وہ بیٹھ جائے گا۔ لیٹے گا۔ سونے کی کوشش کرے گا۔ خواب دیکھنے کی ناکام سعی کرے گا۔

اندھے دودھ کا رنگ بتا رہے ہیں اور آنکھوں والے استعجابیہ "اچھا! اچھا!"

کہہ رہے ہیں۔ سارے رہائشی مکان دفاتر بن چکے ہیں۔ دیواریں پیشاب خانے میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ لوگ لقمہ منہ میں لیتے ہیں اور غصہ میں چینی اور نمک کے مرتبان زور سے پٹکتے ہیں۔ انگلیاں چاٹتے ہیں اور غصہ میں ان میں دانت کاٹ لیتے ہیں۔ خون نکلتا ہے تو بڑی امیدوں کے ساتھ اسے چوستے ہیں اور پھر نفرت کے ساتھ تھو تھو کرنے لگتے ہیں۔ کڑواہٹ، کیلا پن، ترشی، مٹھاس، نمکین، زبان کوئی بھی ذائقہ محسوس نہیں کرتی۔ لگتا ہے زبان کی جگہ منہ میں بے جان پلاسٹک ہے...... سب ایک دوسرے کا منہ نوچنے لگتے ہیں۔

ان ہنگاموں سے دور ایک احتجاجی پیٹ پر پتھر باندھے زرد ہوتے ہوئے میدان میں بیٹھا چہچہاتے پرندوں کو دیکھتا ہے اور نیلگوں آسمان میں ڈوبتا ہے۔ ابھرتا ہے اور پھر ڈوبتا ہے۔ اس کے پورے وجود میں کیف و سرور کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اس آدمی نے لام میں شامل ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ بھیڑ میں گم ہونے سے اُسے نفرت رہی ہے۔ اشاروں پر ناچنے سے ازلی بیر ہے۔ اس نے خارجی نظام کو انا کی ٹھوکر مار کر ان سب احکامات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے جن پر اس کے اندر کی کائنات لبیک نہیں کہے۔ کچھ ہی دیر میں سنگسار کرنے والی پرچھائیوں کا ہجوم آکر اسے مار ڈالے گا۔ آدمی کے مرنے پر اس کے مغز سے ایسا تناور درخت اُگے گا جس کی جڑیں کاٹے نہیں کٹیں گی اور جس کے پھلوں کا ذائقہ آنکھوں سے پتھر اُگائے گا ——— وہ اگر نہیں مرا تو پاگل خانے بھیج دیا جائے گا۔ دماغ کی دُھلائی کے بعد اسے پھر لام میں بھیجا جائے گا لیکن وہ نیلگوں آسمان کی طرف بھاگے گا یہ طے ہے۔

کچھ لوگ سڑک پر چل رہے ہیں اور چلتے ہی جا رہے ہیں۔ کچھ لوگ بیٹھے ہیں اور مستقل بیٹھے ہیں۔ کچھ لوگ سڑک کو سلا رہے ہیں اور سڑک انھیں جگا رہی ہے۔

سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر نہیں ہونے کی طرح ہیں اور ایک بچہ سڑک کے بیچوں بیچ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہاتھوں میں بم لیے "ماں..... ماں...... " چیخ رہا ہے۔

ت

سطوت رسول

دائروں میں گھرے قیدی

وہ کہنے کو پانچ تھے !

ان میں سے ہر شخص یہ کہہ رہا تھا ، کہ وہ دھرتی کا آخری گنہگار ہے ۔ سجدوں سے اُن کی جبینیں عرق آلود تھیں ۔

مگر کیوں ؟

ایسے بہت سے لوگ اس بستی میں تھے ۔ جن کی شعلہ مزاجی ، سفلہ پروری میں ان کی ظاہری و باطنی خباثت بھی شامل تھی ۔ مگر ؟ آج پھر اُن میں یہی تذکرہ تھا کہ ان میں سے دھرتی کا بوجھ کون ہے ۔

اس نازک مسئلے کو سمجھنے کے لیے سب ہی لڑ رہے تھے ۔

کاش وہ ؟

آخری گنہگار ہوتے

جب رات کو اٹھ کر ایک عاصی نے خدا سے گڑ گڑا کر کہا کہ اے خدا سن ، میں طرح طرح کے ظلم کرتا رہا ۔ چوری چکاری ، زنا بالجبر ، قتل غارتگری اور آمرد پرستی ، مگر تو نے ہم سے باز پرس نہیں کی بلکہ میری ہوس کی کھوپڑی کو ہونکتا رہا ۔ کبھی میری اصلاح نہیں چاہی ۔

میں نے ہر قدم پر نیکی اور بدی کرتے ہوئے انسان کو دیکھا

مگر —— اپنے نفسِ امارہ کو مطمئن رکھا۔ اور بدی کی قوتوں سے لڑتا رہا۔
آہ —— آج پھر یہ گناہ مجھ سے ہو رہا ہے۔
اور جو اکثر ہوتا رہے گا
اے میرے مالک ۔ اے میرے آقا۔ اے میرے ربِ اَرض السمٰوات مجھ پر رحم کر۔ کہ ہم ٹھکرائے ہوئے مقہور بندے ہیں۔

دوسرا درویش۔ جو کسی کہنہ سال ممی میں لپٹا ہوا اپنی قبر جیسی گپھا سے باہر آیا۔ وہ —— ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ کر چیخنے لگا کہ میں وہی آخری شخص ہوں جو اس دھرتی کا بیٹا ہے۔ جس کے جنم پر خوشیاں منائی گئی تھیں اور شادیانے بجے تھے۔ مگر آج وہی شخص حنوط دی ہوئی نعش ہے اِس کے سوا اور کچھ نہیں؟۔
رات کے سناٹے میں جنگلوں سے آتی ہوئی سائیں سائیں کی آوازیں چیخیں اور شور۔ اور پھر قہقہے بلند ہوتے ہیں۔ پھر ڈوب جاتے ہیں۔ ایک اتھاہ سکوت جاگتا رہ جاتا ہے۔

تیسرا درویش۔ صاحبو میری بات بھی سنو، اور غور سے سنو، اپنے سر کو دھنو۔ کیونکہ میں مٹی اور پانی کا بنا ہوا ایک انسان یعنی اشرف المخلوقات کا ایک ادنیٰ ذرّہ ہوں۔ جس کے خمیر میں بغاوت مضمر ہے۔ جو انسانوں کا قاتل ہے۔ جو جنگلوں میں لوگوں کی کھوپڑیاں توڑ کر اس میں پانی پیتا ہے۔ سائرن بجتا ہے۔ چیختا ہے۔ چیختا ہے۔ ۔ ۔ ۔ اور دیر تک چیختا رہتا ہے۔ کاش کہ دنیا پر تباہی آتی اور میں اِس منظر کو اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا۔ اور سوم رس پیتا۔ ہا ہا ہا ۔ ۔ ۔ ۔
ایک طویل قہقہہ مار کر اس پہاڑی کی چوٹی سے کود جانا کہ یہی میرا انت ہے؟ انت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اَنت ! ؟

چوتھا شخص۔ ایک ہجوم میں گھرا ہوا کھڑا ہے۔ لوگ اس کے پاس کھڑے ہو کر اُس کی شان میں قصیدہ پڑھ رہے ہیں۔ مگر وہ نامُراد اسٹیج پر ایک مسخرے کی طرح اِدھر اُدھر کی باتیں بنا رہا ہے۔ لوگو سنو، میں ایک مسخرہ ہوں، میرا کام لوگوں کو ہنسانا ہے اور آپ کا کام ہنسنا ہے میں اپنے ساتھ طرح طرح کے ڈبے ایک پٹاری میں رکھتا ہوں۔ دیکھو اس پٹاری میں اجداد کے سونپے ہوئے کھلونے ہیں۔ میں ان کو بازار میں لا کر کھولتا ہوں تو اس میں سے نکلتا ہوا بچّہ جو ایک جمورا ہے میری ہی طرح اس دنیا کا ایک آوارہ لڑکا۔ جو گھر سے بھاگ کر میرے پاس آگیا ہے اور میں اُسے شہر شہر، قریہ قریہ، لیے گھومتا ہوں، مجھے اُس کی ضرورت ہے اور اُسے میری۔ کیونکہ یہی وہ لڑکا ہے —؟

جو میرے مرنے کے بعد میرا جانشین ہوگا۔ اور اس عظیم بوجھ کو اٹھائے گا۔

جو میں ایک مدت سے اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے گھوم رہا ہوں۔

آہستہ آہستہ ابھرتا ہوا شور کم ہوجاتا ہے۔ وہی لڑکا مرغا بنا ہوا گھگھیا کر دہائی دیتا ہے۔ مگر کوئی نہیں سنتا۔ سب مورت کی طرح خاموش ہیں۔ پردہ گر جاتا ہے —— منظر کے بدلنے تک —— لوگ چپ ہیں۔

پانچواں شخص ایک سادھو مہاتما ہے۔ جو اپنی کٹیا میں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ ایک شمشان کا مالک ہے۔ بہت سی ہڈیاں بکھری ہوئی ہیں۔ وہ دیکھ رہا ہے، بس دیکھے چلا جا رہا ہے یہ منظر، زور سے چیختا ہے۔ ایک بچے کی کھوپڑی اُس کے سامنے پڑی ہے۔ وہ چپ چاپ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ دھیرے دھیرے اُس کی آنکھیں سرخ ہوگئی ہیں۔ جنونوں کا تناؤ بڑھ گیا ہے۔ اُس کا پورا جسم لرز رہا ہے۔ اور وہ ایک لکڑی کے اشارے سے اس کھوپڑی سے کہتا ہے کہ تیرے آنے کا مقصد اس دنیا میں کیا تھا۔ اور تو کیوں اس دنیا سے چلا گیا —

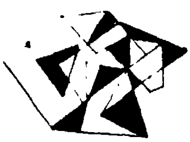
بھگوان مجھے اس کا جواب دے کہ اس معصوم نے کیا قصور کیا تھا، ہنستے ہوئے کنول کے پھول نے؟ یہ واقعی پاپی تھا تو کیوں پیدا ہوا۔ اس کی ماں نے اُسے تخلیق کیا، اور اِسے کن ارمان و حوصلوں سے پالا۔ اور آج یہ مور کھ بے زبان ہے۔ اور اس کا یہ پنجر میرے پیروں میں پڑا ہوا ہے۔ وہ ایک لمحہ چپ ہو کر چیختا ہے۔ پھر زور سے چیختا ہے۔

پیچھے سے بہت سے قہقہے اس کا پیچھا کرتے ہیں، کہ یہ سب دھوکہ ہے۔
آوا گون کا چکر ——
موت ہی اوّل و آخر ہے
موت —— موت —— موت

پس منظر

اس سنسان پہاڑی کا منظر عجیب ہے۔ وہ پانچوں آج پھر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ ان میں ہر شخص اپنے نہ ہونے کا دعوے دار ہے۔ اور کہہ رہا ہے کہ وہ آخری گنہ گار ہے اِس دھرتی کا؟

اے خدا ہمیں اس کی سزا دے کہ ہم پیروں تلے روندے جائیں اور اپنی ہستی کو فنا کر دیں۔ آنسوؤں سے تر جبینیں سجدے میں گر گئیں۔ اور دیر تک روتی رہیں۔
اے ربِ السمٰوات و یوم المکافات ہم پر رحم فرما ——
اے اللہ رؤف بالعِبادِ،
کہ ہم دھرتی کے آخری غم زدہ لوگ ہیں۔



تنہائی

چندر پرکاش خوبصورت نام ہے ۔ ہے نا ۔ یہ کہانی جس چندر پرکاش سے متعلق ہے وہ بھی خاصا خوبصورت آدمی ہے ۔ کم از کم کبھی رہا ضرور ہوگا ۔ آج اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہے اور اس کے لمبے چوڑے اور کسرتی بدن کے وہ سارے ختم گوشت پوست نے بھر دیے ہیں جن کے ہونے سے آدمی چست و چابک اور نہ ہونے سے ڈھیلا اور فربہ لگتا ہے ۔ پچاس سال بڑی ظالم عمر ہے مگر

چندر پرکاش ایک مقامی کالج میں انگریزی ادبیات کے معلّم ہیں ۔ لٹریچر پڑھنا پڑھانا تو خیر ان کا پیشہ ہی ہے مگر لٹریچر میں یا لٹریچر کے بارے میں گفتگو ان کا محبوب مشغلہ ہے ۔ وہ لکھتے بھی خوب ہیں ۔ تنقیدی مضامین کے علاوہ وہ انگریزی بلینک ورس میں بھی دخل رکھتے ہیں ۔ اُردو ہندی کے اکثر ادبا اور شعرا ان کے ارد گرد منڈلاتے رہتے ہیں تاکہ وہ ان پر انگریزی میں مضامین لکھیں ۔ ہر مقامی انگریزی اخبار اور رسالہ ان کے مضامین چھاپتا ہے ۔ اپنے جاننے والے اکثر ادبا اور ان کے فن کے بارے میں چندر پرکاش نے مضامین لکھے ہیں ۔ ایسے مضامین سے انھیں کیا ملتا ہے یہ تو وہی جانیں مگر ان ادیبوں سے انھیں بے پناہ عزت اور احترام ملتا ہے ۔ ہندی اور اُردو کی اکثر کتابوں کی رسم اجرا کے موقعوں پر وہ صف اوّل میں بیٹھے دکھائی دیتے ہیں ۔

پروفیسر چندر پرکاش کو پروفیسر کہلانے کا بہت شوق ہے ۔ آپ انھیں پروفیسر

کہتے رہیں وہ آپ پر اپنی نظرِ کرم بنائے رکھیں گے اور اگر آپ ادیب وغیرہ ایسی کوئی شے ہیں تو آج نہیں تو کل ایک نہ ایک دن وہ آپ کے فن اور شخصیت پر ایک آدھ اچھا یا ذرا کم اچھا (وہ برا، قطعی برا کبھی نہیں لکھتے) مضمون ضرور لکھیں گے جو چھپے گا اور جس کی چرچا بھی بھلے ہی کسی اور نہ جگہ نہ ہو کافی ہاؤس میں ضرور ہو گی۔ ہمارے بہت سے بیچارے ادیب کافی ہاؤس میں بطور ادیب پہچانے جانے کو ہی ریکگنیشن سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پروفیسر پرکاش کی اہمیت ان کے نزدیک کسی انجانی ادبی اکادمی کی سی ہے۔

پروفیسر چندر پرکاش دلّی کے کافی ہاؤس کی جان ہیں کہنے کو تو ہم بھی ایک چھوٹے سے ادیب ہیں اور کبھی کبھار ایک آدھ خاصی اچھی کہانی بھی لکھ لیتے ہیں مگر ہم نے چندر پرکاش کو کبھی اس مسکین نظر سے نہیں دیکھا جس سے ہمارے دوسرے ہم عصر دیکھا کرتے ہیں کیونکہ ان کی معرفت جاوِدانی ہونے کا اپنا کوئی ارادہ نہیں، کہانی لکھنا ہمارا مشغلہ ضرور ہے مگر پیشہ نہیں۔

یہ تو رہی تمہید یا پروفیسر چندر پرکاش کی گوناگوں ذات سے مختصر تعارف۔ اب ذرا اُس قصہ کو بھی سُن لیجئے جس کو لے کر ہمیں مجبور لکھنا پڑ رہا ہے۔

مکان کی تلاش میں ہم نے نئی دلّی کے جنوب کی تقریباً ہر کالونی چھان ماری تھی۔ مکان تھے، بہت تھے مگر ہماری ضرورت کے مطابق کہیں بھی کوئی مکان ہمیں نہ ملا تھا۔ میاں بیوی اور چھوٹے بڑے ملا کر چار بچے۔ بچیاں۔ تین کمرے تو ہر صورت میں ہونے ہی چاہئیں۔ ایک بچوں کے لیے، ایک ہمارے یعنی میاں بیوی کے لیے اور ایک مہمانوں کے لیے جسے مغربی اسٹائل میں ڈرائنگ روم کہا جاتا ہے۔ اگر کہیں کوئی اس قسم کا سیٹ تھا بھی، وہ ہماری دسترس (جس کی حد پانچ سو روپیہ ماہانہ تھی) سے باہر تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس نئی کالونی میں کوئی نہ کوئی گھر ہماری ضرورت اور حیثیت کے مطابق ضرور مل جائے گا اور واقعی مل بھی گیا، یہ ایک دو منزلہ مکان تھا۔ نیچے مکان مالک رہتا تھا اور اوپر کا حصّہ کرایہ کے لیے تھا جیسا کہ عام طور پر

ہوتا ہے۔ اس طرح مالک مکان کرایہ دار پر نگرانی کے علاوہ اسے پوری طرح قابو میں بھی رکھ سکتا ہے۔ بوقت ضرورت اوپر والوں کا پانی بند کر سکتا ہے اور پانی آپ جانتے ہیں فی زمانہ بہت بڑا ہتھیار ہے۔ پانی کی ضرورت بڑے بڑے ہنگامے کھڑی کر سکتی ہے۔ نہ معلوم کتنی لڑائیاں پانی کے لیے لڑی گئی ہیں۔

نوکر (یا نوکر نما ایک صاحب) ہمیں صاحب خانہ کے ڈرائنگ روم سے ملے بغیر باہر والے برآمدے میں بٹھا کر نہ جانے کہاں چلا گیا اور ہم میاں بیوی نہ جانے کب تک چپ چاپ بیٹھے مکان مالک کا انتظار کرتے رہے۔ سامنے سینٹرل ٹیبل پر پڑے رنگا رنگ میگزین و رسائل وغیرہ نہ ہوتے تو وقت گزارنا مشکل ہو جاتا، کوئی بیس منٹ بعد وہ حضرت دوبارہ تشریف لائے تو ساتھ میں چائے کی ایک پر تکلف ٹرے بھی تھی جس میں دو پیالی چائے اور دو گلاس ٹھنڈے پانی کے علاوہ ایک پلیٹ تازہ تلے ہوئے آلو کے قتلوں کی بھی تھی۔ ”آپ چائے لیجئے پھر آپ کو آپ کا سیٹ بھی دکھا دیں گے — آپ کا سیٹ تو گویا ان حضرت نے ہمیں اپنا کرایہ دار چن لیا تھا۔

”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ ہم لوگ تو چائے پی کر ہی آئے ہیں“ ہم نے تکلفاً مسکرا کر اس صبح کا پہلا جھوٹ بولا۔

”چائے تو حضرت ایک رسم ہے کوئی غذا تو ہے نہیں، جس کی کمی یا زیادتی سے کوئی ایسا فرق پڑ جائے گا۔“

ظاہر تھا کہ اس قسم کا برجستہ جملہ کوئی ایسا شخص جو محض نوکر ہو ادا نہیں کر سکتا تھا ابھی ہم کچھ اس قسم کا سوچ ہی رہے تھے کہ دوسرا جملہ آیا۔

”علاوہ ازیں باہر بارش بھی تو ہو رہی ہے ظاہر ہے کہ آپ کو ادھر کچھ دیر تو رکنا ہی رکنا ہے پھر کیوں نہ ہر کام اطمینان سے کیا جائے۔“

آپ ؟

جی میرا نام چندر ہے ۔ چندر موہن ۔ مجھے یار لوگ چندو بھی کہتے ہیں۔ میں فوٹوگرافی کے ایک مقامی اسٹڈیو میں سیلز مین ہوں اور پروفیسر صاحب یعنی صاحب خانہ کا ناتی اور دوست ہوں چونکہ ہم دونوں اس دنیا میں اکیلے ہیں اس لیے میں ہی ان کے ساتھ رہتا ہوں۔

"اب ہمیں" آپ کا سیٹ اور چائے اور تلے ہوئے آلوؤں کی بات سمجھ میں آئی۔ ہماری بیگم کو ایک نظر دیکھ کر ہی چندر، چندو یعنی چندر موہن صاحب نے کم از کم اپنی طرف سے ہمیں کرایہ دار چن لیا تھا۔

"جی گھر ہی میں ہیں مگر اس وقت ذرا سو رہے ہیں رات کو بہت دیر سے سوتے ہیں اس لیے صبح اٹھتے بھی بڑی دیر سے ہیں ۔ چھٹی والے دن تو دس سے پہلے کبھی نہیں اٹھتے تو گیا، ہم کہتے کہتے رک گئے کیونکہ اب دس نو بجا ہی چاہتے تھے۔

چائے سے نبٹ کر ہم تینوں اوپر گئے مکان ہر لحاظ سے معقول تھا دو بیڈ روم تھے دو باتھ رسوئی گھر اور ڈرائنگ روم ان کے علاوہ صاف ستھری کھلی چھت اور سارے کا سارا آسمان اور ستارے اور چاند اور سورج اور ہوا جو شہروں میں اتنی نایاب ہوتی ہے۔

ہم نے کرایہ پوچھا تو چندر موہن صاحب نے ہمیں براہ راست مکان مالک سے بات کرنے کا مشورہ دیا، پیشتر اس کے کہ ہم کوئی اور بات کرتے نیچے سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"چندو شرما جی نے مکان دیکھ لیا ہو تو انھیں نیچے لے آؤ۔"

شرما جی؟ ظاہر تھا کہ مکان مالک یا جن صاحب نے بھی ہمیں پکارا تھا ہمیں جانتے تھے، ہم نے سوالیہ نگاہوں سے چندر کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہے تھے۔

ہم نیچے اتر آئے تو دیکھا کہ پروفیسر چندر پرکاش صاحب حیدرآبادی تہمد

باندھے ننگ دھڑنگ کھڑے ہیں۔ ہمیں بیگم کے ساتھ دیکھ کر قدر جھجکتے ہوئے بولے۔
"ارے چندو تو نے بتایا کیوں نہیں کہ بھابی بھی ساتھ ہیں۔" وہ بیگم کے لیے بھابی کا لقب کچھ اس ڈھنگ سے استعمال کر رہے تھے گویا مدتوں سے انھیں اسی طرح مخاطب کرنے کے عادی ہوں۔ ان کے جھجکنے کے ڈھنگ سے البتہ صاف ظاہر تھا کہ انھیں ہماری بیگم کی موجودگی کا علم تھا اور وہ جان بوجھ کر اس طرح آدھے آدم بنے کھڑے تھے۔ غالباً بیگم کو اپنے جسم کی خوبصورتی اور تناسب وغیرہ سے مرعوب کرنے کی غرض سے۔
چندر پرکاش صاحب ویسے تو ایک حسین شخصیت ہیں ہی ان کا جسم بھی خوب تھا۔ پچاس برسوں کے باوجود تنا ہوا چست کسرتی۔ کپڑوں میں تو وہ ایک دم فربہ دکھائی دیتے تھے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھاکر اور خود ڈھنگ کے کپڑے پہن کر لوٹنے کو کہہ کر وہ گھر کے اندر چلے گئے اور کوئی دس منٹ بعد لوٹے۔ اس بیچ ہم دونوں نے کمرہ کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا چندر صاحب باہر تشریف لے گئے تھے۔ اب ہم اور بیگم کمرہ میں اکیلے تھے۔
کمرہ کے ایک کونہ میں بڑے بک شلیف کے اوپر کسی بڑی ہی خوبصورت عورت کی تصویر خاصے بڑے اور قیمتی فریم میں جڑی سارے کمرہ کی فضا میں ایک خاص قسم کا تہذیبی اضافہ کر رہی تھی۔ تصویر میں جانے کیا تھا، بار بار ہماری نظریں اسی طرف اٹھ اٹھ جاتی تھیں، بالآخر ہم دونوں اٹھ کر اس تصویر کے قریب چلے گئے۔ "ارے" ایک دم ہم دونوں کی زبانوں سے نکلا۔ "یہ کیا"
یہ تصویر ہماری چہیتی سالی یعنی بیگم کی چھوٹی بہن منجو کی تھی۔ منجو جو آج کل لندن میں تھی اور ایک خوبصورت بچے کی ماں تھی۔ منجو کو خط لکھنے کا بڑا شوق تھا اور ہر مہینہ اپنی خیر و عافیت سے مطلع کرتی رہتی تھی دونوں بہنیں ایک دوسرے پر جان چھڑکتی تھیں ــــ مگر وہ تصویر یہاں کیسے چلی آئی۔ بالکل ایسی ہی گرچہ قدرے چھوٹی، ایک تصویر

کی کاپی ہماری فیملی البم میں بھی تھی اور ابھی چند روز پہلے ہی ہم نے اس تصویر کی دو درجن کاپیوں کا رنگون اسٹوڈیو کو آرڈر دیا تھا۔ یہ تصویریں منجو کی سسرال والوں نے طلب کی تھیں۔

بیگم جو ابھی تک نئے مکان کو دیکھ کر بے حد مسرور تھیں یکایک سیریس ہوگئیں۔ پروفیسر صاحب قبلہ لوٹے تو خوب بنے ٹھنے تھے۔ ہمیں بک شیلف کے قریب کھڑا دیکھ کر ایک دم کھل اُٹھے کیسی لگی میری سلیکشن؟

"بہت اچھی" ہم نے جواب دیا۔ ظاہر ہے کہ آپ جیسے علم و ادب کے ایک کامیاب معلّم کے گھر میں اسی قسم کی کتابیں ہونا چاہئیں۔ آپ کا شوق قابل ستائش ہے۔" ہم نے جان بوجھ کر عورت کے پورٹریٹ کا ذکر نہ کیا۔

"شکریہ" پروفیسر صاحب واقعی بے حد خوش تھے۔

مگر یہ محترمہ؟ بیگم نے پوچھ ہی لیا۔

"ارے یہ ایک لمبی کہانی ہے بھابی صاحبہ" پروفیسر نے ایک دم جیسے بوکھلا کر کہا۔ ان کے چہرے کے رنگ یکایک بدلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ایسی عجیب و غریب کیفیت طاری ہوگئی ان کے وجود پر گویا وہ ماضی کے کسی بہت ہی اہم مرحلہ میں یکایک لوٹ گئے ہوں۔ اور ماضی کی کوئی بڑی ہی دکھ بھری یاد انھیں بے پناہ ذہنی کوفت بلکہ اذیت پہنچا رہی ہو۔ بیگم اب ایک دم چپ ہوگئیں تھیں ان کی بہن کا پروفیسر یا کسی بھی غیر مرد سے کبھی اس قسم کا گہرا تعلق رہا تھا یہ انھیں قطعی معلوم نہ تھا اور سب کچھ ایک دم جان لینے کے اشتیاق میں وہ یہ بھی بھول گئی تھیں کہ وہ ہمارے ساتھ مکان دیکھنے کے لیے آئی تھیں۔

پروفیسر جو ایک ٹک اس تصویر کو دیکھے جا رہا تھا اور ظاہر تھا کہ وہ اسی میں قطعی طور پر کھو گیا ہے۔ خاصے لمبے وقفہ کے بعد جب ہماری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں نمناک

تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان میں سے آنسوؤں کی دو مہین مہین ندیاں بھی بہہ نکلیں۔ کافی دیر اسی طرح حیران وششدر سنجیدہ اور چپ رہنے کے بعد وہ جب گویا ہوئے تو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زبان سے نہیں دل کے کسی کونے سے کوئی پرانی بھولی بسری آواز نکالنے کی ناکام سعی کر رہے ہوں مگر کوشش کے باوجود بات زبان پر نہ آرہی ہو۔

"مرد کی آنکھوں میں آنسو ہے نا شرم کی بات؟"

ہم دونوں میں سے جب کوئی کچھ نہ بولا تو وہ پھر چپ ہو گئے۔

اب ہم لوگ صوفہ پر آبیٹھے تھے۔ بڑی سیٹ پر ہم دونوں اور پروفیسر جیندر پرکاش ہمارے بالمقابل رکھی صوفہ چیئر پر۔

ہمت اور حوصلہ جمع کر کے آخر ہم نے کہا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اَن جانے میں آپ کی کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ یقین جانیے۔ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔

"یہ سکیشنی کی تصویر ہے سکیشنی جو میری ہم جماعت تھی۔" پروفیسر نے ہماری رسمی معذرت کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"مگر یہ تو" بیگم نہ جانے کیا کہتے کہتے سنبھل گئیں۔

"ایک نوجوان عورت کی تصویر ہے۔" پروفیسر نے جیسے بیگم کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ اس بیچ ہم نے بیگم کو چپ رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ خود بھی چپ رہنے ہی میں مصلحت سمجھتے ہوئے ہم نے پروفیسر کی طرف کچھ ایسے انداز سے دیکھا جس کا مطلب تھا۔ آپ جو کچھ کہنا چاہتے بخدا ضرور کہیئے اس سے آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

"یہ بیس سال پرانی تصویر ہے بھابھی مگر سکیشنی زندہ رہی ہوتی تو بھی میرا ایمان ہے کہ وہ آج بھی ایسی ہی لگتی کم از کم اُسے اسی طرح ایسے ہی بنائے رکھنے کے لیے میں اپنی جان تک دے سکتا تھا۔"

اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے رُک گئے۔ ایک عجیب حزین سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر یکایک نمودار ہوئی اور وہ پھر اداس ہو گئے۔ اس اداسی میں بے بسی بھی تھی اور شرمندگی بھی........

"کون مرتا ہے کسی کے لیے کسی کے لیے جان دینے کا حوصلہ آج کس میں ہے۔ مرنا بہت مشکل ہے شرما جی!" اب وہ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ "آج کل تو ماں بھی اپنے جوان بیٹے کے لیے نہیں مر سکتی۔ میں تو ایک....." وہ پھر رُک گئے۔ "لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، رومیو جولیٹ پرانے قصے ہیں محبت کے۔ کلاسیکی عہد کی روایات۔ جانے وہ کیسے لوگ تھے، ہم تو شرما جی! بے حیا لوگ ہیں، بے حیا اور طوطا چشم۔ ہم میں سے کون کسی کے لیے مرتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے جان تک دے سکتے ہیں وہ مر گئی۔ میرے سامنے میرے ہاتھوں میں بوند بوند اس کی زندگی بہتی رہی اور میں محض ایک تماشائی کی طرح دیکھتا گیا۔ اس کے درد کی کیا شدت رہی ہوگی۔ موم کی طرح پل پل پگھلتی ہوئی بہتی ہوئی زندگی کے درد کا کون اندازہ کر سکتا ہے مگر اپنے آخری لمحات میں بھی وہ اپنے آنچل سے میرے ہی آنسو پونچھتی رہی۔ جیسے میرے آنسو اس کے لیے اپنی موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس کے بجائے اگر کہیں میں مر گیا ہوتا تو وہ کیا کرتی۔ وہی جو میں نے کیا۔ نہ جانے مجھے کیوں کر یقین ہے کہ وہ میری طرح بے حیا نہ تھی۔ وہ میرے ساتھ ہی جان دے دیتی۔ ایک بار اس نے کہا تھا "تم پر کاش ہو میں تمہاری چھایا ہوں۔ تم ہو اسی سے میں ہوں، تمہارے بغیر میرا کوئی وجود نہیں........" گویا میری ذات ہی اس کی ہستی کا واحد سہارا تھی میں نہ رہتا تو وہ بھی نہ رہتی۔ عورت بہت مہان ہوتی ہے شرما جی۔ آدمی عورت کی دُنیا ہوتا ہے مگر آدمی کی دنیا بہت لمبی چوڑی پھیلی ہوئی دھوپ چھاؤں ہے جس میں عورت ہے تو، مگر سب کچھ نہیں۔ کچھ

ہے تو بادلوں کے سایوں میں پنپنے والے رنگین شیریں خوابوں کی سی ایک مستی ہے، نہ جانے ایسا کیوں ہے نہ جانے یہ سب جانتے بوجھتے ہوئے بھی لوگ کیوں محبت کرتے ہیں کیوں ایک ساتھ جینے مرنے کے جھوٹے وعدے کرتے ہیں۔ کیچڑ میں پڑے پڑے بھی ستاروں کی طرف جھانکتے رہنا آدمی کی پرانی عادت ہے۔ یہ عادت کبھی نہیں جائے گی۔ یہ چلی جائے تو زندگی کیسے چلے۔ یہ میٹھا سر سبز جھوٹ ہی تو زندگی کا سہارا ہے اسی پر تو یہ دنیا اور اس کے رشتے ناتے قائم ہیں۔۔۔۔۔

"جھوٹ فریب کی یہ خوبصورت دُنیا۔۔۔"

دیکھئے نا وہ نہیں ہے اور میں نے یہ گھر بنوایا ہے اسے خوبصورت اور آرام دہ بنانے کی ہر طرح پوری کوشش کی ہے۔ یہ کمرہ سجایا ہے یہ نیا فرنیچر، یہ قیمتی قالین، یہ کتابیں، یہ الماری، اس بات کی توضامن ہیں کہ میں زندہ ہوں اور اسی طرح زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ یہ آنسو جو میں اپنے محبوب کی یادمیں کبھی کبھی بہا دیتا ہوں میں سمجھتا ہوں یہ بھی جینے کا ایک حربہ ایک ڈھنگ ایک بہانہ ہے۔

اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئے، آنکھیں موند کر انھوں نے اپنا سارا جسم صوفہ چیر کی بیک پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔۔۔۔ جب دیر تک وہ یوں ہی پڑے رہے تو ہمیں لگا کہ مصلحتاً ہی سہی کچھ نہ کچھ کہنا ہمارے لیے بھی ضروری ہے۔ مگر ہم نے جو کیا وہ بناوٹ نہ تھی ہمارے دل کی آواز تھی۔ آپ نے اچھی صورت، صحت، جائداد اور آمدنی وغیرہ کے باوجود آج تک شادی نہ کی، یہی کیا کم ہے۔ مرجانا میرے نزدیک اتنی بڑی قربانی نہیں جتنی درد کو اس طرح دل میں سموئے اور سمیٹے جئے جانے میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں اچھا ہی ہوا جو آپ نے کبھی شادی نہ کی۔ سکینہ سے آپ کی شادی ہو گئی ہوتی تو آپ کے جذبۂ عشق میں یہ شدت نہ رہتی۔"

پروفیسر نے آنکھیں کھول کر حیرت سے ہم دونوں کی طرف دیکھا "آپ کیا کہہ رہے

ہیں سکیشنی تو میری بیوی تھی۔"

تو آپ نے شادی بھی کی تھی۔" اب تو بیگم کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور وہ بوکھلا سی گئیں۔ "سکیشنی میرے سکول کے ہیڈ ماسٹر کی چھوٹی بیٹی تھی۔"

ہم نے دیکھا کہ بیگم کے تنے ہوئے خدّوخال قدرے ڈھیلے پڑے ہیں اور انھیں قدرے تسلّی بھی ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ تصویر والی لڑکی کی بڑی بہن تو ہو سکتی تھیں۔ مگر ان کے والد کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر وغیرہ نہ تھے۔ محکمہ جنگلات کے ایک بڑے افسر تھے۔ یہ تو اب ظاہر ہی تھا کہ پوری مشابہت کے باوجود تصویر والی لڑکی منجو نہ تھی، سلیشنی بھی۔ کون جانے۔ کہتے ہیں دنیا میں کوئی دو چہرے ایک جیسے نہیں ہوتے، سوا جڑواں بہنوں یا بھائیوں کے۔ مگر دنیا کو بنانے والے کے لیے کیا مشکل ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے ہماری منجو سکیشنی ہی کا دوسرا جنم ہو۔ ہو کیا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہے۔ پروفیسر کو بتا دیا جائے کہ سلیشنی مری نہیں، زندہ ہے اور واقعی آج بھی اسی طرح لگتی ہے جیسے بیس سال پہلے لگتی تھی تو کیا ہو۔ وہ خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جس سے منجو کا بنا بنایا سورگ جہنم بن جائے۔ مصلحت اسی میں ہے کہ چپ رہا جائے۔ یہ غم پروفیسر کا نجی اثاثہ ہے۔ گزری ہوئی وہ ساعتیں اب مٹی بن چکی ہیں، اب اس مردہ مٹی میں دوسری قسم کی الجھنوں کے جھاڑ بو دیے گئے تو انھیں لہو کی کھاد سے سینچنا ہوگا۔

" اچھا طالب علم ہونے کی وجہ سے میں ہیڈ ماسٹر کا چہیتا شاگرد تھا اور اُن کے گھر میں میرا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا کبھی ان کی کوئی فائل پہنچانے تو کبھی سکول کے مختلف امتحانات کے ریزلٹ ٹیبولیٹ کرنے میں ان کی مدد کے لیے۔ سکیشنی جس کا کوئی بھائی نہ تھا۔ تب مجھے دادا کہہ کر بلاتی تھی اور خدا گواہ ہے کہ تب میرے من میں بھی اس کے تئیں کوئی ایسا ویسا وِچار نہ تھا۔ وہ میرے گورو کی بیٹی تھی اور

تقریباً میری ہی ہم عمر۔ اس کا احترام کرنا میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی پڑھائی میں بھی اس کی مدد کیا کرتا تھا۔ خاص کر حساب وغیرہ میں جس میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک روز اس نے کہا تھا "حساب خالص مردانہ سبجیکٹ ہے مجھے تو کسی طرح بس پاس کرنا ہے"۔ "آگے نہیں پڑھوگی"۔ میں نے پوچھا تھا۔

"تم کہوگے تو پڑھ لوں گی ورنہ نہیں۔ مجھے نوکری وکری تو کرنا نہیں پھر کیوں ان کتابوں سے ماتھا پچی کی جائے۔"

"میرے کہنے پر ہی کیوں پڑھوگی۔"

"لوگ کیوں پڑھتے ہیں؟۔

اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے۔

نہیں سورج میں کھڑا ہونے کے لیے اس نے انگریزی کے مشہور محاورے کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

تمھیں سورج میں کھڑا ہونا پسند نہیں۔

سورج کی چھایا میرے لیے زیادہ سکھ دایک ہے۔ اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونے کا نہ میرا کوئی ارادہ ہے نہ اس کی سکت ہی مجھ میں ہے۔ میں تو تمہاری چھایا میں جینا چاہتی ہوں یہی دیدی اور پیا چاہتے ہیں۔"

کسی عام لڑکی کے لیے اس طرح کی بات کہہ سکنا کتنا مشکل ہے۔ سکیشنی کے لیے یہ بات اس طرح بغیر اُلجھے الجھائے کہہ دینا فطری تھا۔

پیار کا یہ پہلا انکُر تھا جو بعد میں ایک وشال پیڑ بن گیا۔

کالج میں ہم لوگ اکٹھے داخل ہوئے تھے اور بی۔ اے بھی ہم نے اکٹھے پاس کیا۔ میرے اصرار پر ایم۔ اے میں بھی اس نے داخلہ لے لیا۔ ہم دونوں انگریزی زبان وادب کے طالب علم تھے اور گھنٹوں اپنے سبجیکٹ کے کسی ایک مضمون کو

لے کر ہم بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔ سکینشی بڑی ذہین لڑکی تھی اور مجھے اکثر لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ جانتی ہے۔ اس کے والد انگریزی زبان کے ماہرین میں سے مانے جاتے تھے اور یہ ظاہر تھا کہ ان کی قربت میں رہ کر سکینشی کی علم اور لٹریچر سے اس کی واقفیت مجھ سے کہیں زیادہ تھی پھر بھی اس نے میرے برابر نمبر کبھی نہیں لیے تھے۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ جان بوجھ کر وہ میرا مقابلہ نہ کرتی تھی۔ مبادا اس سے میری دِل شکنی ہو۔

ایم۔ اے کا آخری سال تھا۔ ایک دن وہ کالج نہ آئی، دوسرے دن آئی تو مجھ سے ملے بغیر چپ چاپ چلی گئی۔ پھر اُس کا آنا جانا اسی طرح رہنے لگا۔ کبھی آتی کبھی نہ آتی۔ ایک دن میں نے اُسے ڈانٹا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو پڑی میں نے پیار سے اس کا ماتھا سہلایا تو معلوم ہوا کہ اسے بخار ہے۔ ماتھا سُلگتے ہوئے اپلے کے مانند گرم تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ بہت بیمار تھی۔ بے ماں کی بچی کس کو بتاتی اپنے دُکھ کی بات۔ اسپرین کھانے سے بخار اتر جاتا تو کالج چلی آتی ورنہ گھر پڑی رہتی۔

چند ہی دنوں میں اس کی بیماری جیسے مشتہر ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے بیماری کو ٹی بی کی فرسٹ سٹیج قرار دے دیا۔ آج کل تو ٹی بی کوئی ایسی خطرناک بیماری نہیں رہی مگر تب یعنی آج سے بیس سال پہلے یہ موذی بیماری تقریباً مہلک مانی جاتی تھی اور اس سے بچ جانا ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ سننے میں آیا کہ اس کی ماں بھی اسی بیماری سے مری تھی۔

"تو کیا میں بھی مر جاؤں گی۔" ایک بار اس نے ہسپتال کے بیڈ پر لیٹے لیٹے پوچھا تھا۔

"نہیں تم کیوں مرو گی۔ ابھی تو ہمیں شادی کرنا ہے۔ تمھیں میرے بچوں کی ماں بننا ہے۔"

"سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم مجھ سے شادی کر لوگے؟"

"اصلی شادی تو ہماری کب کی ہو چکی ہے اب تو صرف گونا ہونا باقی ہے۔"

نہ جانے میرے ان بظاہر معمولی الفاظ میں کیا جادو تھا کونسی دوا یا مرہم تھی کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے تندرست ہونا شروع ہو گئی اور چند ہی دنوں میں گھر بھی لوٹ آئی۔ .... بیماری کی وجہ سے اس کا فائنل نہ ہو سکا تھا اور میں ایم۔ اے پاس کر کے اپنے ہی کالج میں لیکچرار بن گیا تھا۔ نوکری کے پہلے ہی سال گرمیوں کی چھٹیوں سے کوئی ہفتہ بھر پہلے خاندان کے ہر فرد کی مرضی کے خلاف میں نے سکیشنی سے بیاہ کر لیا اور پورے دو مہینے ہم رانی کھیت میں ہنی مون مناتے رہے۔

اتنا پیار کیا میں نے سکیشنی سے اور اتنا پیار دیا اس نے مجھے کہ اس ایک جنم میں تو کیا اگلے دس جنموں تک مجھے کسی دوسری عورت کے پیار کی ضرورت نہیں رہی۔ پھر ایک دن معلوم ہوا کہ سکیشنی ماں بننے والی ہے یعنی میں باپ بننے والا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں دنیا میں پہلا باپ بننے والا تھا سکیشنی جیسی اپسرا کے بچے کا باپ ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔

"ہم نے کچھ جلدی تو نہیں کی" ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔

"جلدی کیسی پورا وقت ہی تو لے رہی ہوں۔ ویسے میں چاہتی ہوں کہ یہ سب جلدی ہو جائے تمہیں نہ ہو مگر مجھے جلدی ہے کون جانے۔" شاید اسے سب کچھ معلوم تھا.........

آپ مانیں گی نہیں بھابھی مگر یہ واقعی سچ ہے کہ سکیشنی جیسی خوبصورت عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ آپ نے ابھی ابھی اس کی تصویر دیکھی ہے یقین مانیے کہ تصویر میں بھی اگرچہ وہ بے پناہ حسین دکھائی دیتی ہے اور یہ تصویر بھی ایک بڑے اچھے فوٹوگرافر کا کارنامہ ہے مگر یہ بھی پورے طور سے میری سکیشنی

کی تصویر نہیں، اس کا محض ایک عکس ہے ایک سایہ ہے۔ خدا کی اپنی ہاتھوں سے بنائی ہوئی اس اپسرا اور کیمرہ کے محدود آرٹ کے اس عکس میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اے کاش! اس کی تصویر بنانے والا کوئی روی ورما ہوتا، کوئی ڈاونچی کوئی ریمبرانٹ، کوئی مائیکل اینجلو ہوتا۔

سچ تو یہ ہے بھابی کہ اب مر جانے کو جی چاہتا ہے چندر موہن جسے آپ لوگوں نے ابھی ابھی دیکھا ہے میرا دور کا رشتہ دار ہے۔ اس نے بھی سکیشنی کو دیکھ رکھا ہے۔ سکیشنی کے بارے میں میرے دل کی دھڑکنیں سننے کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتا ہے محض اسی وجہ سے مجھے اسی کی قربت گوارا ہے ورنہ ؎

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

ظاہر تھا کہ بیگم کے ذہن میں ایک ساتھ سو سو سوالات ابھر رہے تھے اور ان کے دل و دماغ میں ایک طوفان بپا تھا۔ ہم نے انھیں اشارے سے منع کر دیا تھا ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ وہ کیا کیا کہہ یا پوچھ بیٹھتیں۔ اچانک پروفیسر کے منہ سے نکل گیا۔ "بھابھی آپ حیران ہوں گی مگر یہ واقعی سچ ہے کہ آپ کے اور میری مرحوم بیوی کے کچھ انگ جیسے ماتھا، سر کے بال، بھویں، آنکھیں، ناک اور ہونٹ اتنے ملتے جلتے ہیں ایک دوسرے سے کہ گمان ہوتا ہے کہ آپ دونوں سگی بہنیں ہیں۔

بیگم نے جواب نہیں دیا۔ پروفیسر اپنی سکیشنی کا راگ اسی رَو میں اور بھی نہ جانے کب تک الاپتا رہتا اگر اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز اُسے نہ روک لیتی۔

اس نے ٹیلی فون اٹھا لیا۔ تار کے دوسرے سرے پر نہ جانے کون تھا مگر جو تھا اور جو بھی بات وہ کہہ رہا تھا پروفیسر کو غیر معمولی طور پر پریشان کیے جا رہی تھی۔ وہ بہت گھبرا گیا تھا اور بڑی مشکل سے اپنی حقیقت چھپا رہا تھا۔ دوسری طرف کے سوالوں

کی بوچھاڑ کے جواب میں جو الفاظ اس کے منہ سے نکل رہے تھے اس بات کی نظیر تھے کہ ہم لوگوں سے وہ کچھ چھپانا چاہتا ہے۔ ان کی ہاں ہوں، سوری، ویری سوری کے علاوہ بالآخر جو الفاظ ہماری سمجھ میں آئے وہ یہ تھے کہ چندر موہن گھر میں نہیں ہیں اور وہ ان کے آتے ہی وہ چیز لوٹا دیں گے جس کو لے کر اتنی جھک جھک ہو رہی تھی۔ آخر میں انھوں نے جھلّا کر کہا "آپ نے آدمی بھیج ہی دیا ہے تو پھر اس قدر چلّانے کی کیا ضرورت تھی۔"

ریسور ٹیلی فون کے آلے میں رکھ کر پروفیسر صاحب لوٹے تو بری طرح بوکھلائے ہوئے تھے۔ اپنا ذہنی توازن درست کرنے کی غرض سے انھوں نے سگریٹ سلگا لیا۔

کوئی دو تین منٹ تک وہ کچھ نہ بولے، نہ ہم دونوں میں سے ہی کچھ کہتے بن پڑا۔

ہم سوچ رہے تھے کہ پروفیسر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ آدمی کا غم اس کا ذاتی سرمایہ ہوتا ہے جسے وہ بانٹے بھی تو کیسے اور کن لوگوں میں۔ کون کسی دوسرے کا بوجھ اٹھاتا ہے۔

ادھر بیگم سوچ رہی تھیں۔ یہ عورت میری بہن نہیں ہو سکتی مگر دو صورتیں ایکدم ایک جیسی کیسے ہو سکتی ہیں۔ سکیشنی بیس سال پہلے مری تھی۔ منجو لگ بھگ اسی عمر کی ہے ہو سکتا ہے سکیشنی ہی کی آتما ہو۔ مجھے پروفیسر کو بتا دینا چاہیے کہ ہوبہو اسی شکل کی ایک دوسری عورت بھی ہے جو میری بہن ہے پر بیاہتا ہے اور ایک عدد خوبصورت بچے کی ماں ہے۔ .... اگر یہ سن کر پروفیسر کے سر پر کوئی نیا جنون سوار ہو گیا تو کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بہت پیار کرتا ہے۔ اسی صورت کی ایک دوسری زندہ عورت دیکھ کر کون جانے اُسے کیا ہو جائے وہ پاگل بھی ہو سکتا ہے اور منجو کو سکیشنی سمجھ کر کوئی ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے جس سے منجو کی بنی بنائی گرہستی برباد ہو جائے۔ نہ بابا نا۔ چپ رہنے ہی میں مصلحت ہے اور یہ بھی طے ہے کہ یہ مکان چاہے

کیسا بھی اچھا اور سستا ملتا ہو ہمیں یہاں آکر نہیں رہنا، وہ ابھی ابھی کہہ رہا تھا کہ اسے میری صورت میں بھی اپنی مرحوم بیوی کے خدّ وخال دکھائی دیتے ہیں۔ نہ بابا نا۔ یہ ویسے ہی اتنے شکّی مزاج ہیں۔ مجھے جان بوجھ کر اپنے گھروں میں طوفان کھڑا نہیں کر لینا۔ کون سا ہم مکان خرید رہے ہیں ہمیں کرایہ پر ہی تو لینا ہے یہ نہیں اور سہی۔

بہ مشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ باہر ایک سکوٹر آکر رُکا جس میں چندر موہن صاحب کے علاوہ ایک دوسرے حضرت بھی تھے۔ ان لوگوں کو ایک نظر دیکھ کر پروفیسر گھر کے اندر چلا گیا۔

وہ لوگ جیسے ہی کمرے میں گھسے چندر موہن نے آگے بڑھ کر سکیشنی کی تصویر کو اٹھا لیا۔ یہ رہی آپ کی امانت، داس صاحب بلا وجہ خفا ہو رہے تھے میں تو محض بھائی صاحب کو فریم دکھانے کے لیے لے آیا تھا۔"

نو وارد نے کہا "ابھی پرسوں ہی میں نے اس تصویر کی درجن بھر کاپیاں نکالی ہیں۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر وہ قدرے جھجکا۔

"ارے شرما جی آپ! یہ آپ کی سالی ہی کی تصویر ہے۔ داس صاحب پریشان تھے کہ آج شام جب آپ تصویریں لینے آئیں گے تو وہ کیا جواب دیں گے۔ بد قسمتی سے نگیٹیو خراب ہو گیا ہے اور کاپیاں اب نکالی نہیں جا سکتیں۔

ہم میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا" میں نے دیکھا کہ بیگم صاحبہ کا غصّہ بھی کافور ہو گیا ہے۔ اور وہ بڑے لطیف انداز سے مسکرا رہی ہیں۔

"چندر موہن نے پوچھا مکان آپ کو کیسا لگا۔"

جواب بیگم نے دیا "مکان تو ٹھیک ہے بھائی صاحب مگر اب صاحب خانہ لو اسے ہمیں اٹھلاتے نہ بنے گا۔" اتنا کہہ کر ہم باہر نکل آئے۔ راستے میں کافی دور سا چلتے رہنے کے بعد بیگم نے کہا چلو چھٹی ہوئی آپ کو اچھا خاصا پلاٹ مل گیا۔

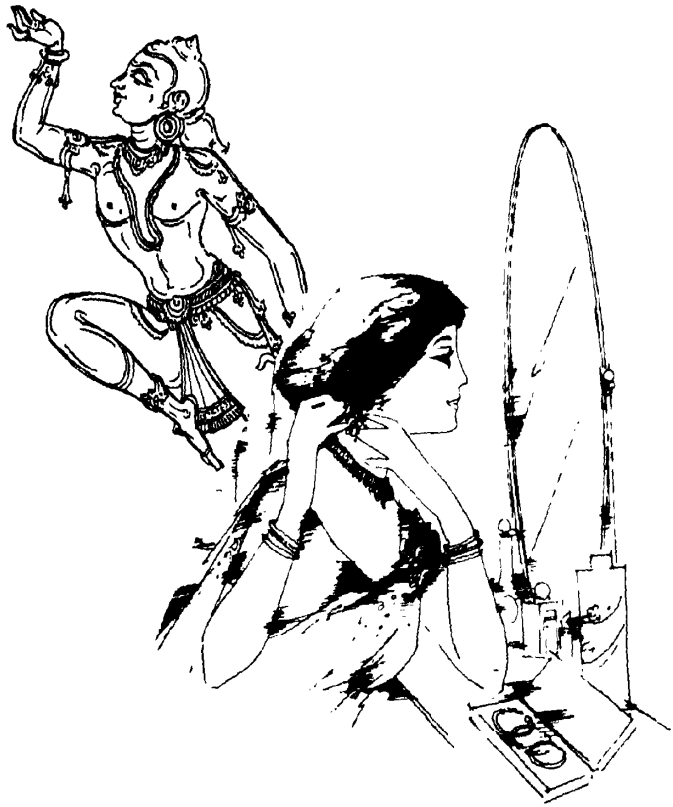
پھر کچھ دیر رُک کر بولیں وہ پرکاش اور چھایا والا مکالمہ آپ کو کیسا لگا۔"

"مکالمے پر ہی کیا موقوف ساری کہانی بڑھیا تھی۔!"

"وہ مکالمہ شرت چندر چیٹرجی کی مشہور کہانی "پرکاش اور چھایا" کا ہے۔

"ظاہر ہے کہ پروفیسر بہت پڑھتا ہے"

نہ بیچارہ اکیلا آدمی۔



گوپال متل

غزل

شاداں نہ ہو گر مجھ پہ کڑا وقت پڑا ہے
تو زد میں ہے جس وقت کی اس سے بھی کڑا ہے

ہے دھوپ مرے سر پہ مگر تو بھی مری جاں
گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں کھڑا ہے

کیا شان ہے واللہ حسینؓ ابن علیؓ کی
سر کٹ گیا قد پھر بھی حریفوں سے بڑا ہے

ہم لاش سمجھ کر جسے پھینک آئے تھے وہ شخص
چٹّان کی مانند عَلَم بن کے کھڑا ہے

ہاں ٹوٹ گیا وہ بھی شجر تھا جو تناور
کچھ دیر مگر تُند ہواؤں سے لڑا ہے

خورشید الاسلام

غزل

کب تلک بے مہریِ حالات کی باتیں کریں
جام کو چھلکائیں اوجِ ذات کی باتیں کریں

دن میں دیکھیں اک رو پہلے گنگناتے دن کا خواب
رات میں اک جگمگاتی رات کی باتیں کریں

فرش سے بھیجیں سوئے عرشِ بریں وحیِ انام
عرش سے اتری ہوئی آیات کی باتیں کریں

کھول دیں دل کے دریچے جائیں پھولوں سے لپٹ
کوئی موسم ہو بھری برسات کی باتیں کریں

آج کی شب یوں گذاریں نازِ بے جا ہی سہی
خاندانِ عشق کے سادات کی باتیں کریں

زندگی آفات ہے، آفات سے جائیں گذر
زندگی سوغات ہے، سوغات کی باتیں کریں

زخمِ دل، زخمِ خموشی، زخمِ عبرت، زخمِ ننگ
لذّتیں اتنی ہیں، کن لذّات کی باتیں کریں

ڈوب جائیں رات کے سینے میں اور ڈھونڈیں نشاط
پھر تصوّر میں کسی بارات کی باتیں کریں
لہلہاتے دو بدن اور سینۂ شب کا گداز
کیوں نہ یاروں سے انہی اوقات کی باتیں کریں
دل کے سوتے جاگ اٹھے ہیں یہ ساعت ہے عجیب
آؤ ایسے میں خمارِ ذات کی باتیں کریں

خورشیدالاسلام

غزل

جتنے نغمے تھے وجہِ خلش بن گئے، جتنے نالے تھے صرفِ ہوا ہو گئے
ہم وہی ہیں جو کل تھے مگر کیا ہوا، ہم وہی ہیں مگر کیا سے کیا ہو گئے
جن کے دامن تہی اور خالی تھے دل، جن کی جرأت تھی کم اور جاں مضمحل
آستانوں پہ سجدے وہ کرتے رہے، رفتہ رفتہ ہمارے خدا ہو گئے
اِس زمانے کے جو میر و سلطان تھے، نوعِ آدم میں یعنی جو انسان تھے
دل سے پائی انہوں نے وہ نشو و نما، تیرے کوچے کے آخر گدا ہو گئے
شور سینوں میں اُٹھ اُٹھ کے دبتے رہے، دل جگر دَورِ گردوں میں کھپتے رہے
ہاتھ کتنے تھے یاں جو قلم ہو گئے، ساز کیا کیا تھے جو بے صدا ہو گئے
یار دنیا کے سانچے میں ڈھلتے رہے، شمعِ فانوس تھے ہم پگھلتے رہے
اپنی تنہا روی، اپنا سوزِ دروں، ہم بھی دنیا میں اک ماجرا ہو گئے
اب نہ خطرہ ہے دل میں نہ کوئی خلش، ایک باقی رہا ہے تو رنگِ تپش
دل سبک اور سادہ ہے اس طور سے، قرض جتنے تھے گویا ادا ہو گئے
غم سنورتے رہے، ہم سنبھلتے رہے، شوقِ منزل کے شیوے بدلتے رہے
تھے جو نزدیک ہم سے وہ اب دور ہیں، تھے جو ناآشنا آشنا ہو گئے

خورشید الاسلام

غزل

ملو نہ تم بھی کبھی ہم سے آشنا کی طرح
کہاں ملے ہے کوئی آدمی خدا کی طرح

نہ تیرے پاس رہے اور نہ تجھ سے دور رہے
تری نظر میں رہے ہیں تری حیا کی طرح

غریب، مشک کی خوشبو سے ہو گیا رسوا
خُتن بھی دیس ہے کوئی مری خطا کی طرح

رہا ہے کام ہمیں بس خرام سے اپنے
گلوں سے ہم بھی ملے ہیں مگر صبا کی طرح

وہ دن کے خواب جو دیکھے تھے، بے نواؤں نے
کسے خبر تھی کہ اڑ جائیں گے ہوا کی طرح

جبیں پہ حرفِ شکایت لکھا نہ حرفِ الم
چھپا کیے ہیں جگر میں تری جفا کی طرح

خورشید الاسلام

غزل

ربط کیسا تھا دل و دیدۂ و جاں میں پہلے
تھا کوئی اور جہاں اپنے جہاں میں پہلے

دل دھڑکتا ہے تو رونے کی صدا آتی ہے
ایک ہنگامہ سا رہتا تھا مکاں میں پہلے

خاک سی اڑتی ہے سینے میں یقیں کے ہر دم
قافلے آ کے ٹھہرتے تھے گماں میں پہلے

یک بیک دل سے چھلک پڑتی تھی اک موجِ طرب
لذتِ جاں تھی عجب شورشِ جاں میں پہلے

اب تردد ہے، تامل ہے، تاسف ہے تمام
تاب تھی غم میں، تمنا تھی فغاں میں پہلے

اب جو ہے گرمئ بازار تو، ہم اس میں نہیں
ہم بھی تھے گرمئ بازارِ جہاں میں پہلے

لہلہاتا ہے جو قامت میں قیامت کا چمن
یہ سجاوٹ تو نہ تھی سروِ رواں میں پہلے

صف بہ صف بندشِ اعضا کا برہنہ چم و خم
ایسی یورش بھی نہ دیکھی تھی جہاں میں پہلے

یہ کشش کب تھی بھلا کافِ کرم میں کہ جو ہے
یہ تپش کب تھی بھلا رُدِّ بتاں میں پہلے

کالی داس گپتا رضاؔ

غزل

وقت سے پیچ لڑا ہے تو لڑائے رکھنا
لاکھ طوفان ہوں اشکوں کو دبائے رکھنا

کوئی پستی ترے دامن سے چپک جائے گی
سرِ عظمت کو خوشامد سے بچائے رکھنا

سارے سورج بھی جو بجھتے ہوں تو بجھ جانے دے
ہاں دِیا ایک محبت کا جلائے رکھنا

وقتِ آخر ہے نہ اُڑ جائے ترے غم کی مہک
دو گھڑی اور اسے زلفوں میں بسائے رکھنا

ہاں بہت سخت، بہت بھاری ہے یہ بارِ خرد
جیتے جی سر سے نہ گر جائے اٹھائے رکھنا

ساری دنیا کا یہ کہنا ہے کہ خود دار ہے تُو
اب بگڑ جائے نہ یہ بات بنائے رکھنا

سر سے پا تک یہ ترے زخمِ وفا، کیا کہنا
اپنے آنگن میں یہی پھول سجائے رکھنا

اے رضاؔ! بڑھ کے اُچک لے نہ کہیں دستِ جنوں
دلِ بے تاب کو باتوں میں لگائے رکھنا

کالی داس گپتا رضا

غزل

ٹکڑے چُن کر بکھرے من کے
کھول دے رستے نوجیون کے

نیلے ہونٹ اور پیلا چہرہ
رنگ ہی کتنے ہیں نردھن کے

تُجھ بن میرے ارماں، جیسے
گُل بوٹے اُجڑے آنگن کے

کیا جوڑوں، کیا توڑ نہ ڈالوں
کیسے کھلونے کس بچپن کے

شانتی پر آ کر من ٹھہرا
نام کئی رکھے بھگون کے

منہ کی کالک بھول گئے ہم
دھبّے دھو ڈالے دامن کے

پہلی کرن پنگھٹ پر آئی
یا نکلی رادھا بن ٹھن کے

کیا جانے کیا کھیل ہے جاری
پردے میں اس نیل گگن کے

چاروں دشاؤں پر بھاری ہیں
چار گلاب ترے گلشن کے

باجے گا جے کا کیا سُننا
بول سنو دل کی دھڑکن کے

جا پہنچے ماتھے کی شکن تک
افسانے میری الجھن کے

اندر سے دو ٹکڑے ہو کر
آؤ بھر لیں سوانگ مِلن کے

سوداگر جائے گا اک دن
سپنے لیکر گاؤں سجن کے

لاؤ رضا ہم کو بھی دے دو
دو اک ٹکڑے اپنے فن کے

کالی داس گپتا رضا

غزل

دوڑ کر موت تک گیا کوئی
کیسا جینے سے تھک گیا کوئی

شبِ غم میں مثالِ خیالِ سحر
جیسے شعلہ بھڑک گیا کوئی

میرے وہم و گماں تک آ پہنچا
راستے سے بھٹک گیا کوئی

جی نہ اُٹھا ئیں۔ پھر بھی کیا کم ہے
مجھ کو پھولوں سے ڈھک گیا کوئی

پاس رہتے بھی کچھ قرار نہ تھا
اُس پہ دامن جھٹک گیا کوئی

اک طلب، اک نگاہ، اک منزل
عمر بھر راہ تک گیا کوئی

اُف ری سرمستیاں فقیری کی
سجدہ گہ میں بہک گیا کوئی

رہنے دو اے رضاؔ گلے شکوے
جان تم پر چھڑک گیا کوئی

کالی داس گپتا رضا

غزل

اسی اندھیرے سے نکلے تو جگمگاہٹ بھی
ملال دے چکے اب ایک مسکراہٹ بھی

کوئی بھی فصل ہو، شامل رہا ہی کرتی ہے
چمن کے شور میں نازک سی ایک آہٹ بھی

اسیرِ بربط و مضراب ، گوش بر آواز
مقام رکھتی ہے ہونٹوں کی گنگناہٹ بھی

اٹھا دیا ہے گھٹاؤں نے پیاس کا گھونگھٹ
نظر نواز ہے سبزے کی لہلہاہٹ بھی

فلک تمام ہے اہلِ جنوں کا دیوانہ
سکونِ ماہ بھی بادل کی گڑگڑاہٹ بھی

رضا تمہارے لیے دل پذیر ہیں دونوں
سحر کا نور بھی اور شام کی اداہٹ بھی

کالی داس گپتا رضا

غزل

فلک تو اب بھی وہی ہے وہی زمیں نہ سہی
وہی دماغ وہی دل وہی جبیں نہ سہی

جنوں میں ہونے نہ ہونے کی قید کیا معنی
نگہ کا سحر سہی چشم سرمگیں نہ سہی

ازل سے گرد ہوں میں، خاکپاء صحرا ہوں
کوئی بگولہ مجھے ڈھونڈتا نہیں نہ سہی

مرا وجود ہے مبہم مگر وجود تو ہے
اُفق کے پار سہی اور میں کہیں نہ سہی

مجھی کو لے کے مکمّل ہوئی شبیہہ حیات
اخیر نقش تو ہوں نقشِ اوّلیں نہ سہی

ہمارے حسنِ نظر کا بھی ہے جواب کہیں
تمہارے ایسا حسیں دہر میں کہیں نہ سہی

اب ان کی یاد مرے درد کی دوا ہے رضا
خود ان کے دل میں مرا درد جاگزیں نہ سہی

کالی داس گپتا رضا

غزل

دل نے جس شے کو بہ ہر رنگ جواں دیکھا ہے
زندگی نے اسے بے تاب و تواں دیکھا ہے

کرتے دیکھا ہے خدا والوں کو گنگا اشنان
اہلِ ناقوس کو سر مستِ اذاں دیکھا ہے

ایک سودا ہے لٹا آتے ہیں مالِ اخلاص
ہم نے قیمت کو کہ گاہک کو کہاں دیکھا ہے

کبھی تائیدِ خزاں سے ہوئی تائیدِ بہار
ردِّ خنداں میں کبھی ردِّ فغاں دیکھا ہے

مل رہی ہے مرے افکار کو پرواز نئی
دوشِ افلاک پہ اک تختِ رواں دیکھا ہے

شیشۂ دل لیے گھومے، کوئی پتھر نہ گرا
تجھ کو ارزانیِ غم! آج گراں دیکھا ہے

کون لذّتِ غمِ نو خیز کی جانے جز غار
جس نے کونپل کے ابھرنے کا سماں دیکھا ہے

جس کو کہتے ہیں رضاؔ ایسا پرانا وہ نہیں
اپنے چھٹپن میں اسے ہم نے جواں دیکھا ہے

کالی داس گپتا رضا

غزل

عجب گم ہوگیا ہوں زندگی میں
کہاں ہوں میں خودی یا بے خودی میں

اضافہ ہوگیا ہے دیکھ کتنا
مرے اشکوں سے تیری دلکشی میں

مجھے آہستہ سے آواز دینا
کہیں چونکا نہ دینا خامشی میں

چمن نے تو ھزاروں گُل کِھلائے
ہمیں مُرجھا گئے اس تازگی میں

مرا بچپن، مری خوشیاں، مرے خواب
دھواں سی کچھ لکیریں روشنی میں

وہی قاتل، وہی وحشی، وہی غیر
نہ آئی آدمیّت آدمی میں

خزاں کے ڈر سے برگ و بار لرزاں
وہ جی رہنے کی خواہش تھرتھری میں

رضا کا بھی ٹھکانا ہے وہیں اب
رہا کرتی ہے نخوت جس گلی میں

کالی داس گپتا رضاؔ

غزل

بط سے کام لو میرے جی کی طرح
لب شگفتہ نہ ہونا کلی کی طرح

س کس دستِ غیبی کی ہے منتظر
راستے میں لُٹی پالکی کی طرح

ں کو مہکا گیا اشکِ شرمندگی
پہلے چھینٹے کی سوندھی نمی کی طرح

ہنستے چہروں میں پنہاں الم، الاماں
کون ہنستا ہے دل سے کلی کی طرح

د آئی تری گنگناتی ہوئی
صبحدم بھیرویں راگنی کی طرح

م کہاں تک نباہیں گے اس دور سے
آخر اُٹھ جائیں گے راستی کی طرح

ن جنت کو ترجیح دنیا پہ دے
کون ٹھہرے یہاں اجنبی کی طرح

ندگی تو ہمیشہ سے جلدی میں ہے
پربتوں سے اُترتی ندی کی طرح

ے قدموں تلے ہی جگہ ہے میری
ایک مسلی ہوئی پنکھڑی کی طرح

گو رضاؔ مبتدی ہے مگر دیکھ لو
بات کہہ ہی گیا منتہی کی طرح

کالی داس گپتا رضاؔ

غزل

دل کو پل بھر کے لیے وقفِ الم بھی نہ کیا
ہم خوشی بھول گئے آپ نے غم بھی نہ کیا

کردیے شہر کے شہر اشک بُلانے تہِ آب
وقت نے تنکے کے بہہ جانے کا غم بھی نہ کیا

ہم نہ قاتل ہی بنے اور نہ مسیحا ٹھہرے
زیست بھی دے نہ سکے، سر کو قلم بھی نہ کیا

جاوداں بن کے یہیں لطفِ تمنّا لیتے
خودسری نے ہمیں گمراہِ عدم بھی نہ کیا

غصّے ہونا تھا کہ پیروں سے لپٹ لی دُنیا
ہم نے بے درد پہ جی بھر کے ستم بھی نہ کیا

ہم کہاں ہوتے ہیں تادیبِ عمل سے آزاد
دَیر بھی چھوڑا، غمِ طوفِ حرم بھی نہ کیا

نہ سہی جو نہ بڑھایا مرے رتبے کو رضاؔ
میرے شعروں نے مری قدر کو کم بھی نہ کیا

کالی داس گپتا رضاؔ

غزل

اے بے ہمت ڈھیلے ڈھیلے
جینا حق ہے جی لے جی لے

اک عالم اُن میں بستا تھا
ہائے وہ نیناں نیلے نیلے

ساری بستی خون سے لت پت
سارے چہرے پیلے پیلے

دل میں کوئی چور چھپا ہے
یہ نقشِ پا گیلے گیلے

بچھڑے ساجن کب ملتے ہیں
پیراہن دل سی لے سی لے

ٹہنی ٹہنی میری جنّت
میرا مرقد ٹیلے ٹیلے

پھر سے رضاؔ جی جائے گی دنیا
جامِ تمنّا پی لے پی لے

کالی داس گپتا رضا

غزل

دل بھیگی رات بن گیا ہے
یادوں کی برات بن گیا ہے

پلکوں پہ گھٹا، دھنک نظر میں
جوبن برسات بن گیا ہے

آرام ہمہ جہت اب آرام
دُکھ جزوِ حیات بن گیا ہے

آتے جاتے رُلا رہا ہوں
نالہ خیرات بن گیا ہے

لحظہ لحظہ سرودِ زنجیر
قیدی کی نجات بن گیا ہے

اللہ رے سماں۔ یہ تیرہ بختی؟
دن کالی رات بن گیا ہے

تھا تلخ زمانہ میرے ہوتے
اب قند و نبات بن گیا ہے

رگ رگ میں یہ رقصِ ناز۔ توبہ
غم، غمزۂ ذات بن گیا ہے

محفل میں رضا کا یوں پہنچنا
افسوس کی بات بن گیا ہے

کالی داس گپتا رضا

غزل

تمہاری ہوش مندی کا نشاں ہوں
کبھی ظاہر کبھی سرِ نہاں ہوں

وہ پہلے جستجو اپنے میں کر لے
جو مجھ سے پوچھتا ہے میں کہاں ہوں

اُتر جائے گا غُل میں چترِ شاہی
میں گونگے وقت کی گز بھر زباں ہوں

کُھلے بازار کُھل کھیلوں کوئی دم
دبی دولت ہوں، فریاد و فغاں ہوں

اُجالوں نے مجھے دھندلا دیا ہے
مَیں اب بجھتے چراغوں کا دھواں ہوں

نہیں مرہونِ منّت رہبروں کا
وہیں پہنچیں گی راہیں مَیں جہاں ہوں

رضاؔ دامن کشاں ہے رنگِ دنیا
مَیں سرتاپا غمِ سود و زیاں ہوں

کالی داس گپتا رضاؔ

غزل

جل کے صحرا جب دھواں دینے لگا
دل نوید کارواں دینے لگا

عدل قاتل، منصفی خنجر بکف
ملزم ہستی بیاں دینے لگا

جب بگولے نقشِ پا بھی لے اڑے
خارِ خوں خوردہ نشاں دینے لگا

لذتِ عصیاں کہ بج اٹھے ہیں سنکھ
اور موذن بھی اذاں دینے لگا

کوئی کہہ بیٹھا حدیثِ زندگی
اک دیا بجھ کر دھواں دینے لگا

ہم کو نوکِ خار سے لینا ہے کام
دل پیامِ گل رخاں دینے لگا

اک دھندلکا، اک فسانہ، ایک خواب
ہائے میں کس شے پہ جاں دینے لگا

اے رضاؔ پاتے ہی خرقہ فقر کا
دل حریر و پرنیاں دینے لگا

کاوش بدری

نئی غزل

ئے اک دن سامنے ایسا بھی منظر آئے گا
ہم نہ ہوں گے اوج پر اپنا مقدر آئے گا

نگ نادانوں نے پھینکے چیخ تک نکلی نہیں
دم نکل جائے گا میرا، جب گلِ تر آئے گا

ات دن رہتا ہے زلفِ ماسوا کی چھاؤں میں
جانے کب وہ دیوتا انسان بن کر آئے گا

رزمینِ درد کا دیدار کافی ہے جناب
اس کو کھودو گے تو اشکوں کا سمندر آئے گا

ل پل میں جھیلنا ہوگا ہمیں صدیوں کا دکھ
حشر سے پہلے ہی ورنہ، روزِ محشر آئے گا

سب سے یکساں کُھل کے ملیے غزنوی ہو یا غریب
عام لوگوں کی طرح کوئی پیمبر آئے گا

س قدر بے چین ہونے کی ضرورت ہی نہیں
صبح کا بھولا ہے آخر شام تک گھر آئے گا

ندگی کے راز مجھ پر منکشف ہو تو گئے
اب کے خود میری طرف خلاقِ داور آئے گا

سورۂ رحمان پڑھ کر پھونک آیا ہوں وہاں
دل یہ کہتا ہے کہ خط اس کا برابر آئے گا

فاتحِ دوراں سہی کاوش، مگر دل پھینک ہے
کوچۂ جاناں سے وہ کیا خاک بچ کر جائے گا

کاوشؔ بدری

نئی غزل

بادۂ تلخ کو رہ جانے دو ساغر بدلو
منزلِ ہوش کو پانا ہے تو رہبر بدلو

کاٹ کچھ ایسی نکالو کہ وہ کٹ کر کاٹے
قتل مقصود ہمارا ہے تو خنجر بدلو

گفتگو گر نہیں موزوں تو خموشی بہتر
نامناسب ہیں ادا کار تو منظر بدلو

اور پہنا دو ہر اک زخم کے تکیے کو غلاف
کم سے کم آج کی شب خون کا بستر بدلو

پیکرِ فکر تو پیراہنِ جاں مانگے ہے
ضد کسے ہے کہ روایات کا جوہر بدلو

پائے اظہار میں بج اٹھیں گے از خود گھنگرو
لاکھ رقاصہ تخلیق کے تیور بدلو

سنگ سازی کے لیے ایک ہی پتھر کافی
سنگباری کو خدا کے لیے پتھر بدلو

نظریے رنگ نہیں ہیں کہ بدل دیں کاوشؔ
کچھ بدلنا ہے ضروری تو مقدر بدلو

سلطان اختر

غزل

دستارِ احتیاط بچا کر نہ آئے گا
کوئی بھی اُس گلی سے سُبک سر نہ آئے گا

اُڑ جائیں گے ہوا میں سبھی نقشِ ناتمام
اور موسمِ ہنر بھی پلٹ کر نہ آئے گا

کب تک رہو گے ضد کے احاطے میں خیمہ زن
وہ حدِ احتیاط سے باہر نہ آئے گا

یوں مطمئن ہیں راستے صحنِ سکوت میں
جیسے کبھی صداؤں کا لشکر نہ آئے گا

جو کچھ ہے وہ بہت ہے کہ پھر اس نواح میں
اک لمحۂ سکوں بھی میسر نہ آئے گا

اختر اب انتظار کی پرچھائیاں سمیٹ
اس دھوپ میں وہ موم کا پیکر نہ آئے گا

سلطان اختر

غزل

معراجِ ارتقا ہے تماشا نہ جانیے
تہذیبِ عصرِ نَو کو برہنہ نہ جانیے

ہم چاہتے کچھ اور ہیں کرتے کچھ اور ہیں
یعنی اب اپنے آپ کو اپنا نہ جانیے

ہونے کو اس سفر میں بہت رائیگاں ہوئے
لیکن ہمیں شکست کا نوحہ نہ جانیے

بس اپنی ہاؤ ہُو سے ہی رونق ہے چار سُو
ویرانیوں کو زینتِ صحرا نہ جانیے

طوفاں کا نام سُن کے لرزتی تو ہے مگر
دیوارِ جسم و جاں کو شکستہ نہ جانیے

اُبھرا بہت پہ لوحِ سماعت ہے دور دور
حرفِ صدا کو اب کے کہیں کا نہ جانیے

سنجیدگی کے نام سے خائف ہے زندگی
اخترؔ اسے فریبِ تمنّا نہ جانیے

مظفر حنفی

غزل

(قوافی بہ اعتبارِ صوت)

پھر تصوّر میں وہ خوش وضع آگیا
خوب مطلع ہُوا ہے، مزا آگیا

دوستوں کی عنایت رہی حال پر
آج راہی[1] گیا تو رضا[2] آگیا

زندگی بھر کڑے راستوں کا سفر
پاؤں روکے تو پیکِ قضا آگیا

وہ مرے تلخ اشعار کی گونج تھی
لوگ سمجھے کہ روزِ جزا آگیا

چاند خنجر چلاتا رہا پشت پر
سر پہ سورج برائے سزا آگیا

شش جہت بازگشت اُس کی آمد کی ہے
واقعی آگیا، حبّذا آگیا

اُس کی غزلیں مظفر سنا دیجیے
بہرِ تکمیلِ مقطع فضا[3] آگیا

---

[1] غلام مرتضیٰ راہی [2] حسن رضا [3] فضا کوثری

مظفر حنفی

غزل

کسی کو حشر تک رہنا نہیں ہے
زیادہ کچھ ہمیں کہنا نہیں ہے

مری طغیانیاں ڈھاتی ہیں مجھ کو
وہ دریا ہوں جسے بہنا نہیں ہے

بہت بیٹے، ہزاروں فاختائیں
تری قسمت میں دُکھ سہنا نہیں ہے

لبوں تک آگئی ہے بات دل کی
شگوفہ شاخ کا گہنا نہیں ہے

یہ اکھڑ چال دیتی ہے گواہی
کہ بل باٹم کبھی پہنا نہیں ہے

خورشید سحر

غزل

ردائے سبز سروں سے نہ اب کے ٹلنے دو
گھنے درختوں کو جیسے ہو ساتھ چلنے دو

یہ اور بات کہ میں سنگ سنگ ہوں لیکن
کبھی تو موم کی صورت مجھے پگھلنے دو

تمام چہرے چمکتے دکھائی دیں گے تمہیں
طلسمِ خواب کا منظر ذرا بدلنے دو

صدائے حرفِ عقیدت میں قید کر کے مجھے
حصارِ ذات میں ہی روز و شب ٹہلنے دو

میں شب چراغ اگر ہوں تو بے سبب یعنی
انا کی گونج تو کہتی نہیں کہ جلنے دو

سحر زدہ ہوں میں مجھ سے سحر سحر ملنا
بہت طویل سہی غم کی رات ڈھلنے دو

ملوں گا خود سے بھی اک روز اجنبی کی طرح
مجھے بھی پیرہنِ جسم و جاں بدلنے دو

شناخت آئی تو ڈھونڈے گا پھر مجھے خورشید
بدل رہا ہے جو تصویرِ جاں بدلنے دو

خورشید سحر

غزل

جستجو کی خاک پر ہی سو گئے ہیں روز و شب
میرے جیسے نیم وحشی ہو گئے ہیں روز و شب

پھر وہی سیلِ تباہی پھر وہی بے منظری
پھر مری آنکھوں میں تنہا ہو گئے ہیں روز و شب

میں کسی سے ٹوٹ کر ملتا نہیں ہوں ان دنوں
نیم کے کچھ بیج دِل میں بو گئے ہیں روز و شب

اب مرے چاروں طرف ہے بے پناہی کی صدا
زندگی کے راستوں میں کھو گئے ہیں روز و شب

ہر طرف بکھری ہوئی ہے کالی کالی سی فضا
اک عجب بے نور منظر ہو گئے ہیں روز و شب

آنے والے دن کا اب وہ دیوتا کہلائے گا
اس کے دامن کی سیاہی دھو گئے ہیں روز و شب

فاروق شفق

غزل

نہ پوچھو ہم سے کچھ باتیں ہماری
وہی دن ہیں وہی راتیں ہماری
بجز اک رسم کے کچھ بھی نہیں ہیں
یہ باتیں ، یہ ملاقاتیں ہماری
کھڑے تھے راہ میں گھنگھور بادل
پلٹ آئیں مناجاتیں ہماری
گذرتی رُت کے ہاتھوں میں ملیں گی
سنہرے دن کی سوغاتیں ہماری
کسی دن رنگ لاکر ہی رہیں گی
یہ خاطر اور مداراتیں ہماری
عجب شے ہے غریبوں کا بھی غصہ
ہمیں پر ہیں یہ برساتیں ہماری
گریں دہکے سمندر میں لڑھک کر
وہ جلتی بجھتی سی راتیں ہماری
سوا اپنے نہ کوئی آیا زد پر
عجب نکلیں شفق گھاتیں ہماری

فاروق شفق

غزل

راہ پر ہم یوں تو اپنے دل کو لے آئے بہت
اِس طرف تنہا تھے ہم اور اُس طرف سائے بہت

کیا علاقہ ہے جہاں مٹّی، ہوا، پانی نہ آگ
چھوڑ کر اپنی زمیں ہم دل میں پچھتائے بہت

اوس میں ڈوبا ہُوا منظر تھی اپنی زندگی
پاس کیا جاتے کہ حائل تھے گھنے سائے بہت

لمبی، کالی راتیں ہی شاید مرے حصّے میں تھیں
اس نے مجھ کو سبز، نیلے خواب دکھلائے بہت

گھر کے باہر برف باری، گھر کے اندر تھی گھٹن
لوگ خالی دن میں بیٹھے بیٹھے اُکتائے بہت

بعد مدّت کھُل کے اس سے کچھ دلی باتیں ہوئیں
اب کے موسم میں شجر پر پھول پھل آئے بہت

شمیم قاسمی

غزل

مختلف جلوے دکھا، ہر شکل کو مرغوب کر
بعد میں نازل عتابِ زندگی بھی خوب کر

پتھروں کے جسم میں رکھ دے دھڑکتا دل کوئی
بے زباں چہروں کو دے اپنی زباں، محبوب کر

اب کوئی آہٹ کوئی چہرہ کوئی موسم نہیں!
مر گیا وہ زندگانی کی گھٹن سے اوب کر

لمحۂ فکرِ سخن کو دے دوامِ زندگی—
منتخب اپنے لیے کوئی نیا اسلوب کر

فلسفہ اپنی جگہ کہ زندگی ہے زندگی
مرنے والا مر گیا دریا میں اک دن ڈوب کر

ہر کوئی اپنی سماعت کھو چکا ہے ان دنوں
ہر کسی سے مت یہاں تو قصّہ مصلوب کر

قاسمی جینا اگر ہے تجھ کو شہرِ سنگ میں
ہر نئے موسم کو اپنے نام سے منسوب کر

شکیل مظہری

غزل

ہم تشنگی کو اپنی جبینوں پہ لکھ گئے
یعنی فلک کی بات زمینوں پہ لکھ گئے

اک آرزو تھی دل میں کہ پی جائیں چاندنی
اس آرزو کو غم کے دفینوں پہ لکھ گئے

"اک یادگار شہرِ ستم گر" سمجھ کے ہم
حرفِ وفا کو درد کے زینوں پہ لکھ گئے

تشکیل پا گئے جو دھڑکتے دلوں کے بیچ
ہم وہ اصول اپنے سینوں پہ لکھ گئے

وہ حادثے جو موجِ تہہِ آب سے ہوئے
ان حادثوں کو لوگ سفینوں پہ لکھ گئے

لاسمتیت کا خوف اور آوارگی کا غم
ہم لوگ اپنی اپنی جبینوں پہ لکھ گئے

بے چہرہ منظروں کے المناک مرثیے
کچھ اہلِ درد خاک نشینوں پہ لکھ گئے

کیسا ستم ہے یہ کہ ہوئے ہیں جو لامکاں
اک داستانِ غم وہ مکینوں پہ لکھ گئے

اس دردِ ناشناس میں ہم اے شکیلؔ کیوں
صدیوں کا درد صرف مہینوں پہ لکھ گئے

سید ارشاد حیدر

غزلیں

فکرِ فردا ، تگ و دو شور و شغب لاحاصل
غمِ دیروز سیہ، گریۂ شب لاحاصل
کھو چکا ہوں میں خود اپنے بھی نشانِ کفِ پا
دھند میں ڈھونڈ رہا ہوں کسے اب لاحاصل
تجھ سے بچھڑا تو اداسی تھی ہر اک موسم میں
برگ تھا اڑتا رہا مہر بلب لاحاصل
جانے کب لوٹ کے آئے گا سوالوں کا جواب
کب سے پھیلائے ہیں ہم دستِ طلب لاحاصل

تو لمحہ لمحہ چیختی ہے بے سبب شبِ سیہ
کہ لوٹ آئی ہے دعائے زیرِ لب شبِ سیہ
سوارِ فکر کے اداس بازوؤں سے چھوٹ کر
میں تیرے زانوؤں پہ سر رکھوں گا کب شبِ سیہ
ہر ایک شخص محوِ خواب ہے مگر مرے سوا
کسے صدائیں دے رہی ہے بوالعجب شبِ سیہ
میں اپنی داستاں کا لفظ لفظ تجھ کو دے چکا
تو ہی بتا کہ مرا نام کیا ہے اب شبِ سیہ

نشتر خانقاہی

غزل

بے جھجک، کُھل کے کرو، آگ کو پانی تم بھی
فاحشہ شہر کی یہ رات ہے، زانی تم بھی

آب آہن کہ بہاؤ سے ہے عاری، میں ہوں
بس کہ پابستۂ یک بُعدِ زمانی تم بھی

قتل کا دل سے نہ تھا شاہدِ عینی کوئی
خانقاہی نہ کُھلے اپنی زبانی تم بھی

خوف و بے چہرگی و کرب و شکست و تشکیک
چھوڑتے کاش کوئی اپنی نشانی تم بھی

شہر تیں گرد ہیں افواہ کی صورت، یعنی
روز گھڑتے رہو، خود اپنی کہانی تم بھی

گوشِ یک طفلکِ محروم اذاں شعر مرا
نعمتِ حرف بہ کُفرانِ معانی، تم بھی

چھٹ گئے شمس و ظفر اب ہوں اکیلا تنہا
کل تو اس دشت میں ہمراہ تھے باقی تم بھی

محسن زیدی

غزل

وہ مہرباں ہوا نہ ستم گر ہی ایسا تھا
یا یہ کہیں کہ اپنا مقدر ہی ایسا تھا
رستہ بدل کے بھی تو وہی ٹھوکریں ملیں
حائل ہماری راہ میں پتھر ہی ایسا تھا
مشکل سے کوئی پھول بچا ہوگا باغ میں
اب کے ہوا کے ہاتھ میں خنجر ہی ایسا تھا
جو دائرہ بنا وہ بکھرتا چلا گیا
مرکز ہی اس طرح کا تھا محور ہی ایسا تھا
ٹکرا رہے تھے اپنا سر اک دوسرے سے لوگ
برپا ہر ایک ذہن میں محشر ہی ایسا تھا
اپنے لہو سے گل جو کھلاتا چلا گیا
اس دشتِ بے شجر میں وہ لشکر ہی ایسا تھا
اس شخص سے نمو کی توقع بھی تھی کسے
وہ شخص اپنی ذات سے بنجر ہی ایسا تھا
محسن زمانہ میرا مخالف تو تھا مگر
میرا بھی تھا تصور میں خود سر ہی ایسا تھا

فرحت قادری

غزل

پگھلی تمام برف، ہمیں کیا ملا مگر
پانی میں اپنا گاؤں ہی ڈوبا رہا مگر

منزل تو تا مسافتِ دنیا نہ مل سکی
قدموں سے میرے لپٹا رہا راستہ مگر

سورج پکارتا ہی رہا میرے شہر میں
ہر شخص اپنے آپ میں کھویا رہا مگر

دونوں لکیریں ملتی تھیں حدِ افق کے پاس
حدِّ افق کے بعد بھی تھا فاصلہ مگر

بکھرے ہوئے تھے دھوپ کے ٹکڑے زمین پر
جنگل میں دور تک کوئی سورج نہ تھا مگر

مانا کہ چلتے چلتے میں پتھر میں ڈھل گیا
اِک یادگار بن گئی تیری صدا مگر

حالانکہ زندگی نے کسی سے وفا نہ کی
اُٹھنے کو اب بھی اٹھتے ہیں دستِ دعا مگر

عشرت قادری

غزل

ہر اِک صحیفے سے مہر و وفا کا باب جلا
یہ حرف حرف سمیٹ، اپنا انتخاب جلا
حیات جُرم ہے تو پھونک صورِ اسرافیل
دہکتی آگ میں اپنے تمام خواب جلا
نہ دے سکے مجھے اک لمحہ فرصتِ طاعت
الٰہی! آتشِ دوزخ میں سب عذاب جلا
بلندیوں پہ گذر ہے تو یہ اندھیرے سمیٹ
شرارِ نغمہ سے قندیلِ آفتاب جلا
اب ایک لاش ہوں میں پھینک دو گڑھے میں کہیں
وہ خون تھا جو چراغوں میں بے حساب جلا

ابراہیم اشک

غزل

بھولی بسری ایک کہانی دوہرانے کو چاہے جی
مرتے مرتے جگ بیتے ہیں جی جانے کو چاہے جی
نام وہی پر روپ بدل کر آ بیٹھا ہے پاس کوئی
کسی بہانے کومل تن سے چھو جانے کو چاہے جی
برسوں بیتے من کی ٹھنڈی آگ میں جلتے لیکن اب
لہراتے آنچل سے شعلے بھڑکانے کو چاہے جی
بننے والی بات کہاں اب ورنہ بن کر دکھلاتے
مٹنا بھی آسان نہیں پر مٹ جانے کو چاہے جی
بھرے شہر کے ہنگاموں سے گھبراتے ہیں اب تو ہم
سونے جنگل، اونچے پربت ہو یرانے کو چاہے جی

اختر نظمی

غزل

میرے ہاتھ میں اک پتھر ہے
سب سے قریب مرا ہی سر ہے

آنکھوں کو الزام نہ دیجے
اپنا شہر ہی بے منظر ہے

اس کی راہ یہی ہے، لیکن
میری راہ سے کچھ ہٹ کر ہے

سوکھا ایندھن ہے کشتی میں
پانی میں بھی آگ کا ڈر ہے

نیند سفر ہے تاریکی کا
خواب چراغ راہگزر ہے

کھو بیٹھا ہے سایہ اپنا
کتنا بلند و بالا شجر ہے

کون سنے گا میری صدائیں
کس تک آوازوں کا گزر ہے

نظمی میرا حال نہ پوچھو
آنکھیں خشک ہیں دامن تر ہے

ڈاکٹر یعقوب عامر

غزل

جو شخص ہے خواہش میں گرفتار بہت ہے
یہ موسمِ زرخیز دل آزار بہت ہے

ہستی کے ٹھکانوں پہ ہیں اب بھی وہی پہرے
جینے کی طلب آج بھی دشوار بہت ہے

اس شہرِ بلاخیز میں چھوٹی سی انا ہوں
دنیا مجھے کہتی ہے خطاکار بہت ہے

بستی کے مکینوں سے کہو میں ہوں مسافر
میرے لیے یہ سایۂ دیوار بہت ہے

عامرؔ تری مٹّی میں تو ہے گاؤں کی خوشبو
تو شہر کی دنیا کا پرستار بہت ہے

شاہین بدر

غزل

جلتا، سُلگتا کرب کا لمحہ لئے پھرا
چہرے پہ میں بھی دھوپ کا غازہ لئے پھرا

یہ عہد میٹھے بول کی بھی دے سکا نہ بھیک
میں شہر شہر درد کا کاسہ لئے پھرا

کیا طرفہ ماجرا ہے کہ سورج کے شہر میں
ہر شخص اپنا رینگتا سایہ لئے پھرا

کاغذ پہ بس گئیں مرے لفظوں کی بستیاں
میرا وجود پیاس کا صحرا لئے پھرا

گونگے پیمبروں کے جزیرے میں چارسُو
ہر شخص اپنا اپنا صحیفہ لئے پھرا

خط کا گلاب ذہن معطر نہ کر سکا
نظروں میں بھوکے بچوں کا چہرہ لئے پھرا

وہ آئینہ بدن تھا حفاظت میں سنگ کی
اک میں کہ اپنا ٹوٹا کھلونا لئے پھرا

شبنم سے سینچ سینچ کے 'شاہین بدر' بھی
شاخِ مژہ پہ کرنوں کا غنچہ لئے پھرا

اسلم آزاد

غزل

ندی کے پار اُترنے پہ یہ بتا دینا
روایت اپنی رہی کشتیاں جلا دینا

وہ ایک پنچھی جو مدت سے قید ہے گھر میں
کھُلی فضا میں کسی دن اسے اڑا دینا

تمہارے پیچھے جو سائے کی طرح رہتا ہے
نہ مُڑ کے دیکھنا اس کو نہ تم صدا دینا

کہیں جو لوحِ تعلّق شکستہ سادہ ہو
اسے بھی حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا

جو ہو سکے تو مرے ساتھ دو قدم چلنا
تمام عمر بھٹکنے کی مت سزا دینا

ہمارے گاؤں کی اتھلی ندی نے بخشا ہے
سمندروں کے گھنے قرب کو بھلا دینا

وہ مطمئن ہے بہت اپنے آپ میں لیکن
مرے بکھرنے کا قصہ اسے سُنا دینا

شاہد کلیم

غزل

کوئی منظر مری آنکھوں میں رسیلا نہ رہا
قرمزی رنگوں کا موسم بھی سجیلا نہ رہا

کھو گئی میری نوا راہِ خلا میں جا کر
تیری دنیا میں رسائی کا وسیلہ نہ رہا

دھول اڑتی ہے مرے جسم کے تہہ خانہ میں
اندھے ناسور کا موسم بھی تو گیلا نہ رہا

آسماں نیلا ہوا تیری طرح اے ساگر
میں ترے رنگ میں گھل کر بھی تو نیلا نہ رہا

سرسوں پھولی ہوئی تا دور مضافات میں تھی
شہر کی آنکھوں میں منظر کوئی پیلا نہ رہا

شور اٹھا نہ مچا قہقہہ چوپالوں میں
قصّہ گوئی کا مری طرز نکیلا نہ رہا

منظر سلطانپوری

غزل

اندھیرا چھٹے، کچھ سُجھائی تو دے
امیدوں کا چہرہ دکھائی تو دے
یہ لمحوں کے زنداں میں کب سے ہے قید
مرے جسم کو اب رہائی تو دے
بڑی بھیڑ ہے، دم اُلٹنے لگا
کوئی جا سُکوں کی دکھائی تو دے
سجا تو لئے جسم پر مور پنکھ
مگر رقص تیرا دکھائی تو دے
نگر ہے صداؤں کا مانا مگر
صدا معتبر اک سُنائی تو دے
نہ خاموش خاموش دیکھ اس طرح
میں لُٹتا ہوں مجھ کو بدھائی تو دے
سمولوں میں سارے زمانے کا غم
مرے دل میں اتنی سمائی تو دے

ایم۔ کے۔ اثرؔ

غزل

زخم ہے کون سا جو وقت کی تصویر بنے
پاؤں کے چھالے کہاں پاؤں کی زنجیر بنے

جاگتی آنکھوں میں گھلتی ہے سیاہی شب کی
خواب ایسا کہاں جو زیست کی تعبیر بنے

باعثِ شدتِ غم تیرا تصور تو نہ تھا
لمحے تسکین کے کیوں کرب کی جاگیر بنے

خون میں ڈوبی ہے انصاف کی تحریر یہاں
آج کے آدمی کیوں دار کی تقدیر سے بنے

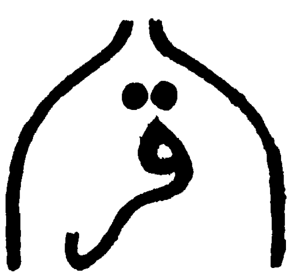
روشنی ملتی نہیں ایسی حرارت سے کبھی
کیسے جلتی ہوئی شب، صبح کی تنویر بنے

جسم کے دشت میں ہم کھو گئے ہنستے ہنستے
اپنے آغاز میں انجام کی تحریر بنے

آج تک کھینچ نہ سکی کھینچتا جاتا ہوں اثرؔ
اِک لکیر ایسی کہ جو آپ کی تصویر بنے

تبصرے

رام پرکاش راہی
ڈاکٹر عنوان چشتی
انجم عثمانی



"اقرا" : شعری مجموعہ

مصنّف : رؤف خیرؔ

پبلشر : گلِ نو پبلی کیشنز حیدرآباد

قیمت : دس روپے

غزلیات، نظمیں، سانیت اور ترائیلے پر مشتمل تخلیقی متفرقات کا یہ منظر نامہ رؤف خیرؔ کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ لب و لہجہ، اسلوب اور موضوعات کی بسیط نوعیت، شاعر کی فنی اور فکری جواں سالی کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ دبستانِ حیدرآباد کا یہ فن کار نئے کیمپ کے اس گروہ سے تعلق رکھتا ہے جو اپنے اجتہاد بکف تخلیقی خمیر کو روایت کی معتبراؤ نرم نرم آنچ سے پختگی کی سمت جاری و ساری رکھے ہوئے ہے لہٰذا موصوف کی تخلیقات کو شعری سفر کی ارتقائی کسوٹیوں پر پرکھنے کا سوال پیش آتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں غزلیات کا پلڑا بھاری ہے جن میں سلاستِ بیان، بہاؤ اور غنائیت کے جذباتی آثار تو ضرور متوجہ کر لیتے ہیں لیکن فکری گہرائی کی عدم موجودگی میں خیال کے نقوش خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ سطحی جاذبیت کے ہموار تغزل کی لَے اور

ہلکی پھلکی شعریت کا احساس تو ہوتا ہے لیکن معانی کی پیچیدہ کردگی کم ہونے کی وجہ سے ایمائیت یا رمزیت کے SKIN DEEP تصورات سے قاری مشکل سے ہی دوچار ہوتا ہے۔ البتہ یہ شعر اس صورتِ حال سے ماورا ہوتے ہوئے اچھے شعر شمار کیے جاسکتے ہیں جن میں شاعر کی عصری آگہی اور نئی حسیت کے اچھوتے نقوش جھلملاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور جن میں طنز و تعریض کے مبہم خد و خال تاثر کی کیفیات کو تیکھاپن عطا کرتے ہیں۔

بچ گیا ہے مرے پیراہن خوش کے صدقے
ورنہ وہ شخص تو باہر مری زد سے کب تھا

نکلے ہم اُس سے ملنے کی خاطر مکان سے
صدیاں ملیں وہ راہ میں لمحات کھو گئے

پھر مرے دور کا چہرہ بھی اجاگر ہوگا
اِک ذرا تو مرے زخموں کو مرتب کر دے

نظم (بمعہ سانیٹ) کے میدان میں رؤف خیر کی تخلیقی صلاحیتیں صحیح معنی میں بروئے کار ہیں "۔ امانت آنے والی ساعتوں کی" ایک ایسی نظم ہے جو شاعر کی نگاہوں کو ان گنت آفاق کی بشارت دیتی ہے۔ احساس کی شدت، مشاہدے کی وسعت اور خیال کی تازگی موصوف کی نظموں میں جا بہ جا ملتی ہے۔ قصہ دل دکھنے کا، صدف ہرف، آنچل، جمنا بہے نرات اس صورتِ حال کی اچھی مثالیں ہیں۔ اسی طرح سانیٹ کی فضا بھی متفرق موضوعات پر خوش آہنگ تاثرات کے لفظی اور معنوی پیکر لیے ہوئے ہے۔

'اقرا' اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کے اشتراک سے منظرِ عام پر آئی ہے۔ چھپائی اور گیٹ اپ اچھی ہے۔ مواد کی نوعیت بسیط ہے اور مختلف مزاج قارئین کے لیے دعوتِ مطالعہ بھی فراہم کرتی ہے۔

لمس اوّل (منظومات)

مصنف : علیم صبا نویدی

ناشر : انجمن مصنفینِ اردو تامل ناڈو، مدراس

قیمت : پانچ روپے پچاس پیسے

محض غزل کے بل بوتے پر منظرِ عام پر آنا اردو شاعر کی اُسی نفسیات کی نشاندہی کرتا ہے جس کے تحت غزل کو نظم پر ترجیح دی جاتی ہے۔ غزل کے ہر شعر میں ایک جداگانہ نفسِ مضمون اور محدود مختصر نظمیاتی کیفیت کا طلسم ہی کچھ ایسا ہے کہ قاری کی توجہ براہِ راست مبذول کر لیتا ہے اور شاعر کو IMPRASSION IS THE LAST IMPRASSION کے احساسِ ناگزیر کے تحت ایک طرح کی خود اعتمادی کے بہت قریب کر دیتا ہے۔ علیم صبا نویدی کے یہاں بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی رہی ہے۔ طرح نو کی غزلیات اور لمسِ اوّل کی منظومات قریباً ایک ہی تخلیقی عرصہ سے تعلق رکھتی ہیں اور اگر یہ منظومات ان غزلیات کے ساتھ ہی منظرِ عام پر آتیں تو منظومات کا اچھوتا اور دیرپا تاثر شاہد ہے کہ علیم صبا نویدی کا فنی شعور اور تخلیقی کردار ہر لحاظ سے ادب شناس ماحول کو متاثر کرتا۔

'سلگتے سائے' آئینہ بدست ' اور' الیہ راجعون جیسے ایک طرح کے موضوعاتی ابواب کے تحت نظموں کی تقسیم حُسنِ ترتیب اور جدّتِ تہذیب کے وہ تیور فراہم کرتی ہے جن سے قاری کی توجہ تر و تازہ رہتی ہے۔ منظومات کے عنوان' بین السطور مواد کی منفرد نوعیت اور اس کے ساتھ اظہار میں پابندی ہئیت کی اُسلوبی اور فنی مرصع سازی مصنّف کو ایک ایسا شاعر ٹھہراتی ہے جس نے جدیدیت کی بے مُہاریت کو کسی حد تک نظم و نسق کی صورت عطا کی ہے۔ گویا نئی شراب کی زنگار نگی سے پرانے شیشوں میں نئے خد و خال جاگ اٹھے ہیں۔ تمام نظمیں رنگ و آہنگ کی تھرتھراہٹ سے معمور ہیں لیکن علامت اور تجرید کے آلاتِ کار کے زیادہ استعمال سے وہ بہت سی نظموں میں مرکزی خیال کی متواتر اور مسلسل فضا پیدا کرنے

سے قاصر رہا ہے جیسے "لکیروں کی سرگوشی" میں آخری دو بندوں میں ٹیپ کا مصرعہ صورت حال کی روشنی سے مصنف کی ذاتی خواہش کے سلسلے کو مربوط کرنے سے رہ گیا ہے۔ لیکن جن نظموں میں تسلسل کی فضا آپ بیتی اور جگ بیتی کے ساتھ فنی انصاف کرتی ہے اور یا جن نظموں میں واقعاتی شعور تخیلی پرواز کے ساتھ توازن اور تواتر کا منظر نامہ پیش کرتا ہے، بڑی کامیاب نظمیں ہیں۔ صبح تخلیق، کارساز، پیاسی تمنا، اَن مٹ رشتہ، مثال کے طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ہندی بحروں کا استعمال شاعر کے یہاں نغمگی کے گوناگوں تیور پیش کرنے کی شعوری کوشش کا آئینہ دار ہے اور کتابت یا طباعت کے سہو کو مدنظر رکھ کر ان نظموں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

مجموعی طور پر لمس اول کی نظمیں لمس اول کا اچھوتا تاثر اجاگر کرتی ہیں اور ان کے رگ و پے میں شاعر کی بساجہت حسیاتی صلاحیتوں کی عکس در عکس اور نقش در نقش صورت حال کروٹیں لیتی ہوئی محسوس کی جا سکتی ہے۔

کم داموں میں اچھی چھپائی کے ساتھ معیاری ادب کی اس پیش کش کے مدنظر انجمن مصنفینِ اردو تامل ناڈو کے لیے ہدیۂ تشکر کی صورت یہی ہے کہ اربابِ ذوق اس تصنیف کا خیر مقدم کریں۔

"آس نراس کی شام" (دوہوں کا مجموعہ)

مصنف : بھگوان داس ناگپال اعجاز

ناشر : سطور پرکاشن دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قیمت : ۷ روپے

اُجلی، کپاسی گیٹ اپ میں اُجلے اور ملائم کاغذ پر چھپی ہوئی یہ کتاب طباعت کے معیار کو اپنا حصہ نہیں بنا سکی۔ ترتیب کی بے تکلف سادگی بھی ۲۹۲ دوہوں پر مشتمل اعجاز کی

کی معصوم اور رسیلی شاعری کی توقعات کے ساتھ انصاف کی حد تک نہیں پہنچتی۔

اعجاز کے دوہوں میں جو بے ساختگی، روانی، رس اور مٹھاس کی فضا ہے وہ ہندی شاعری کی اُن رومانی روایتوں کی یاد دلاتی ہے جو بھگتی رس میں ڈوب کر لافانی ہوگئی تھیں۔ اعجاز کو ساری تحریک بھگتی رس کی شاعری سے ودیعت ہوئی ہے لیکن اس کا محبوب کوئی رام یا کرشن نہیں ہے بلکہ وہ جیتا جاگتا محبوب ہے جو دُنیا میں ہے، دُنیا کا ہے اور اس شخص کے لیے ہے جو اعجاز کے قالب میں ایک دنیا دار کرم یوگی کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ اعجاز اپنے پیار کے روپ میں ہر اس پریمی کے پیار کو پہچانتا اور قبول کرتا ہے جس نے سچے دل سے پیار کیا ہے اور اسے نبھایا ہے۔ ہندی کی پرانی روایت کے تحت اعجاز اپنے جذبات کو نسوانی زاویے سے اکثر پیش کرتا ہے۔ جب وہ ایسی محفل میں اپنے آپ کو پاتا ہے جہاں حسینوں نے رنگ جمائے ہوں تو وہ اپنے آپ کو پرستارِ حُسن کے مذکر لبادے میں بھی ڈھال لیتا ہے۔ اعجاز کے لیے پیار ایک ازلی اور ابدی حقیقت ہے۔ پریمی اور پیار کے تئیں اعجاز کے جذبات ہجر و وصال، بے نیازی، بے رُخی، نازو ادا کی جھانکیوں کے ساتھ اس کے تمام دوہوں میں کروٹیں لیتے ہوئے دکھائی اور سُنائی دیتے ہیں۔ یہ دوہے بطور نمونہ قابلِ غور ہیں۔

پیار میں وہ تاثیر ہے کھلتے من کے ردم لوہے کی دیوار بھی ہو جائے ہے موم
باتیں ہوں گی پیار کی ملا آج ایکانت نین اتاریں آرتی من کا سنئے شانت
مورت ہے تو پیار کی یا دیوی کا روپ نس دن میں پوجا کروں لے چندن کی دھوپ
کہہ دھیرے سے کان میں، اندھیاری ہے رات تارے نہ سُن لیں کہیں تیرے من کی بات
گھر گھر میں پہنچائیے یہ انتم پیغام گونجے تینوں لوک میں ہر پریمی کا نام

اردو ادب میں دوہوں کی یہ کتاب اپنی نوعیت کی تازہ ترین پیش کش اور اضافہ ہے۔ اربابِ ذوق جو میٹھے لب و لہجہ، رنگ و آہنگ کے پرستار ہیں ان کے لیے یہ کتاب گویا گیت مالا کی اہمیت رکھتی ہے اور اس کتاب کی ہر دل عزیزی کی توقع کیا، وہ تو ایک

حقیقت ہے جو اعجاز کے اس روپ کے آئینے میں عکس ریز ہے۔

سُندر اُن کی لیکھنی ، بانکے لیکھن ہار
گھر بیٹھے اعجاز نے جیت لیا سنسار

۱۹۷۷ء کا شعری ادب (ایک انتخاب)

مرتبہ : ساحل احمد
ناشر : اردو رائٹرز گلڈ ، الہ آباد
قیمت : پندرہ روپے

۱۹۷۷ء کے شعری ادب کا یہ انتخاب اپنی نوعیت کی اچھوتی اور اہم پیش کش ہے جس میں نظموں اور غزلوں کو سال کے بارہ مہینوں کی ترتیب سے رکھا گیا ہے اور آخر میں انڈیکس ہے جو شعرا کی بحسب ابجد ترتیب کا پتہ دیتا ہے اور ان جرائد کا حوالہ بھی فراہم کرتا ہے جن سے یہ تخلیقات مستعار ہیں۔

اس شعری منظرنامے کی ترتیب و تہذیب اور تزئین میں جن غیر معمولی جمالیاتی خد و خال کو مدِ نظر رکھنا مقصود تھا وہ تو over doing کا شکار ہو گئے یا اس غیر معیاری اور بے تناسب طباعت کے بحران میں کھو گئے جو اچھے کاغذ پر بھی جاذبِ نظر رنگ نہ جما سکی۔ گیٹ اپ کا طمطراق بھی رنگوں کے گرداب میں الجھ کر رہ گیا۔ نظموں کی طرح غزلوں کو بھی بے ربط اور بے محل عنوانات کے سائے میں ان کی بے ساختگی اور فطری شکل و شباہت سے محروم کر دیا گیا۔

اس تالیف کی ، واقعی رُوحِ رواں وہ خلوص اور ادبی ذوق ہے جس کے تحت برگزیدہ شعرا کی برگزیدہ تخلیقات کو یک جا کر کے اربابِ ذوق کے لیے بڑی حد تک تاریخی اہمیت کی ایک شعری دستاویز پایۂ تکمیل تک پہنچائی گئی ہے۔ اردو ادب کے متذکرہ بالا

طربیہ پہلو کے ساتھ ساتھ یہ المیہ بھی ناقابلِ فراموش ہے کہ ۱۹۷۷ء میں از سرِ نو منظرِ عام پر آنے والے اچھے شاعروں کے علاوہ غزل کے بعض مستند شاعروں کی تخلیقات سے بے وجہ کنارہ کشی کر دی گئی۔ مثال کے طور پر 'تناظر' میں بلراج حیرتؔ، اندر سروپ دت نادانؔ کے ساتھ ساتھ ساغرؔ نظامی اور حسنؔ نعیم کو بھی خاطر میں نہ لایا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ "تُو مرا حاجی بگو" کی تنگ نظر جولانیاں ریڈیو کے افسروں، یونیورسٹی کے پروفیسروں، رسائل کے مدیروں پر مشتمل سے نپے تلے دائروں سے باہر نہ جا سکیں۔ یہ واقعی اس انتخاب کا کمزور پہلو ہے جو اردو ادب میں صحت مند عناصر کی کمی کا غماز ہے۔

مجموعی طور پر 'پسند اپنی اپنی' نظر اپنی اپنی" کے مصداق اس تالیف کے مشمولات اکثر و بیشتر معیاری ہونے کے ناطے دعوتِ مطالعہ کے حامل ہیں اور سنجیدہ ادبی حلقوں میں اس کا خیر مقدم یقینی ہے۔

طرحِ نو (مجموعۂ غزلیات)

مصنف : علیم صبا نویدی

ناشر : تامل ناڈو اردو پبلی کیشنز ایسوسی ایشن مدراس

قیمت : سات روپے

غزلیات کا یہ مجموعہ ۱۹۷۵ء سے ہی قارئین کی نذر رہا ہے۔ ایک نظر دیکھئے تو یہ پیش کش ایک نئی آواز کے بنتے سنورتے چہرے کا دوسرا نام ہے لیکن اس پیکر سیاہ و سفید میں اہم باسمیٰ کی روح کہاں مضمر ہے اور کس زاویے سے دیکھی اور کس کروٹ محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس کا اندازہ موصوف کے مندرجہ ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے جن میں اس کے تخلیقی خمیر کی تہیں، شعری تحرک کے ہیولے' وہ اور" میں یا ہم" کے ضمیری اور علامتی کردار کی نوعیت، نرگسیت آمیز ایمائیت کے عناصر، تخلیقی دیانت کی کسرِ نفسی کے آثار اور ریاضتِ فن کے

ارتقائی خدوخال جھلکتے ہیں۔ یہ شعر مصنف کے ذوقِ سلیم میں تخلیقی سچائی کا بین ثبوت بھی ہیں:

شعورِ غم نے سکھائے ہیں زندگی کے رموز
شعورِ فکر سے معجز بیاں ہوئے ہم لوگ

لرزتی بوند کا جس دن سے ہم پہ راز کھلا
سمندروں کی طرح بے کراں ہوئے ہم لوگ

تمہارے چہرے کے پیچھے تھے اور بھی چہرے
تمام عمر کہاں راز داں ہوئے ہم لوگ

سوچوں کی چاندرات میں لفظوں کے درمیاں
اور ان کی ہتھیلی پہ پیدا ہوا تھا میں

ورنہ میں پھیل گیا ہوتا خلاؤں کی طرح
ہاتھ سورج کا مری سوچ کے ہاتھوں میں نہ تھا

وہ کون شخص ہے، رہتا کہاں ہے ڈھونڈھ صبا
نئے شعور کا غماز جس کا چہرہ ہے

نئی لگن کی پو پھٹی تو کائناتِ فکر میں
صبا نویدی آپ کا ہی تذکرہ ہے دور تک

طرحِ نو پر اٹھائی گئی عمارت کی صورت حال اس ہوا محل کی طرح ہے جو باہر سے لفظیات کی میناکاری کے فیض سے نئی نویلی استعاریت، تجریدیت، علامت آمیز پیکریت کا خوبصورت نقشہ تو فراہم کرتی ہے لیکن خیال کے تنوع یا فکریاتی گہرائی کا احساس نہیں دلاتی۔ زبان و بیان کی خامی یا بے راہ روی کہیں بھی دیکھنے کو نہیں ملتی لیکن بہت سے اشعار اپنے شعری منطق کو اُجاگر نہیں کرتے۔ اور قاری کی جانب سے معنی کی تلاش رعایاتِ لفظی کی بھول بھلیوں میں بے مقام سی ہو جاتی ہیں۔

صبا کی شعری جدوجہد ارتقاء کے عبوری مرحلوں سے بدستور دوچار ہے۔ اس کے یہاں نئے انداز میں نئی بات کہنے کے پرخلوص رجحانات کارفرما ہیں اور جن اشعار میں موصوف نے کم سے کم لفظیاتی ہیر پھیر سے زیادہ سے زیادہ رمزیت پیدا کر کے نفسیاتی اور فکری سچائی کے نقوش ابھارے ہیں ان اشعار کے لیے بھرپور داد دینے کو جی کرتا ہے ذیل کے چند شعروں کی طرف توجہ دلاتا ہوں جو نئی غزل کے معتبر مزاج کے ساتھ ساتھ بے ساختہ رنگ و آہنگ کی شعریت اور تلخ حقائق کی زود اثر ترجمانی کا رسیلاپن بھی لیے ہوئے ہے۔

دیر سے آئے ہیں کچھ لوگ دبے پاؤں مگر
چور اندر کا جبینوں پہ چمک آیا ہے

ملاقاتوں کے شہروں کی خبر یہ دے رہا ہے
ترا چہرہ لگے ہے ان دنوں اخبار مجھ کو

جلا کے اپنے بدن کو دھواں ہوا تھا میں
بکھر بکھر کے زمان و مکاں ہوا تھا میں

یہ کیسا شخص ہے پلکوں پہ گیت گاتا ہے
خموش راتوں میں تنہائیوں کا راگ لیے

کسی نے کھول کے دیکھا نہیں کبھی شاید
ہر اک کتاب سسکتی رہی اندھیرے میں

کسی کے جسم سے اٹھتی ہوئی سبک خوشبو
تمام درد مرا پی گئی اندھیرے میں

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ طرحِ نو کی شاعری روایت سے انحراف کی شاعری ہے جس میں اظہار کا ملبوس خود اعتمادی کے بخیوں کی بنا پر پختگی کے اکتساب پر نظر رکھتا ہے اور اندرونی گداز کو صحیح اور دیرپا سڈولتا میں بدل دینے کے درپے ہے۔ خطۂ مدراس سے اردو کی اس پیش کش کے اوراق میں طباعت کی صفائی کو نستعلیقی توازن اور تناسب کی اشد ضرورت تھی۔ گیٹ اپ دیدہ زیب ہے اور قیمت بالکل مناسب ہے۔

انحراف : مجموعۂ کلام
مصنف : یعقوب راہی
ناشر : علی۔ ایم شمسی، بمبئی
قیمت : پانچ روپے

کتابت کے سہو سے مبرا، صاف اور اچھی چھپائی اس کتاب کی پہلی کشش ہے۔ پیپر بیک پر، راستے اور قدموں کے سادہ اور جلی نشان " انحراف "، کو اسم بامسمیٰ کی ایمائیت کے نقش و نگار تو فراہم کرتے ہیں لیکن بین السطور مواد میں بنیادی طور پر ایک ترقی پسند ذہن کا خمیر ہی نظم اور غزل کے سانچوں میں کروٹیں لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے، مارکسی نظریات اور ان سے وابستہ عملی احتجاج کی جھلکیاں یعقوب راہی کی بیشتر نظموں اور غزلوں

میں ملتی ہیں جنہیں موصوف نے ایک اچھوتے اسلوب اور انفرادی لب و لہجہ میں سمو کر تاثر کی فضا کو ترو تازہ اور برقرار رکھا ہے۔ غزل کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

سرکشی حرفِ مکرر بن جائے — خامشی وجہ ندامت کیوں ہو

ٹھہرا پانی، کائی کھائے، گھٹ گھٹ کر مرجائے — بہتا پانی پتھر توڑے، اپنی راہ بنائے

جہاں کہیں موصوف نے اپنے رومانی میلانات اور اپنی نجی فکر کا سہارا لیا ہے اُس کا فن 'فن برائے فن کے آلاتِ کار سے' سکّے بند نظریات سے محفوظ زندگی کی حقیقتوں کی ترجمانی میں موصوف کی شعری صلاحیتوں کو بے ساختہ رنگ و آہنگ کے ساتھ اجاگر کرتا ہے۔ یہ نظمیں اس نقطۂ نگاہ سے قابلِ غور ہیں: اس دھرتی پر، ہمارا ورثہ، زندگی، امکان۔

'انحراف' یعقوب راہی کی ان شعری کاوشوں کا انتخاب ہے جو ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۵ء تک معرضِ وجود میں آئیں۔ مختلف جریدوں میں منظرِ عام پر آنے والی موصوف کی غزلوں اور نظموں کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ موصوف کے یہاں نئے رجحانات اور رویوں کے صحت مند عناصر اس کے کامیاب شعری سفر اور نئی ارتقا کا پتہ دیتے ہیں۔ (رام پرکاش راہی)

رشتۂ کلام

مصنف : محسن زیدی

قیمت : دس روپے

تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

اگرچہ اردو شاعری کے میدان میں شدّت پسندی کا طوفان تھم گیا ہے۔ پھر بھی اُس کے اثرات ابھی باقی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں اردو شاعروں نے اپنے آپ کو "کلاسیکیت" "ترقی پسندی" اور "جدیدیت" کے خانوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر محصور کر رکھا ہے۔ لیکن اردو شاعروں کا ایک بڑا قافلہ اب بھی ہے جو خود کو کسی ازم یا گروپ سے وابستہ

کرنا پسند نہیں کرتا اور وہ اپنے تخلیقی تجربے اور اس کے ماحصل (تخلیق) پر اعتماد کرتا ہے اور اخلاص کے ساتھ قارئین کے سامنے اپنی متاعِ فن کو پیش کر دیتا ہے۔ محسن زیدی بھی اردو کے انھیں شاعروں میں شامل ہیں، جنھوں نے روایت کے زندہ عناصر کو قبول کیا، تجربے سے تازگی حاصل کی اور اپنے وجود کے داخلی تجربے کو معیار بنا کر اپنی مانوس مگر منفرد شعری جمالیات کی تشکیل کی ہے۔ ان کی شاعری میں غیر شخصی یا کائناتی تجربے بھی ذاتی اور انفرادی تجربے کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب شاعر تخصیص سے تعمیم کی طرف سفر کرتا تھا لیکن اس دور کے سچے اور مخلص فنکار تعمیم سے تخصیص کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ یہ سفر اسلوب اور زبان کی سطح پر بھی ہو رہا ہے اور معنویت نیز افکار کی سطح پر بھی جاری ہے۔ محسن زیدی نے اس سفر میں "دشت" کو استعارہ بنا کر اپنے شخصی اور غیر شخصی تجربوں کی جس فنکاری سے نقش گری کی ہے، اس کی داد نہ دینا سراسر بے انصافی ہے۔ "دشت" اور اسی نوع کے دوسرے استعارے، ان کی شاعری کی فضا بندی کرتے ہیں۔ قاری کے ذہن پر "تلازمات" کی روشنی بکھیرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک اور وصف یہ ہے کہ انھوں نے ماضی کی ماضیت سے حال کی آگہی اور اس کے جمالیاتی اظہار کا کام لیا ہے۔ جس سے ایک خاص شعورِ جمال کے ساتھ معنویت کی حنا بندی ہوئی ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام میں اس نوع کے شعر ہر صفحہ پر دامنِ دل کھینچتے ہیں۔

سوچ کر اس سے ملو، وہ مرا ہمزاد سہی
سحر کر دیتا ہے، ذہنوں پر فسوں ساز ہے وہ

میرے خالی گھر میں ابتک جل رہا ہے اک چراغ
آج بھی روشن میں اپنے گھر کے طاق و در میں ہوں

چاروں طرف بلند نشاں تیرگی کا تھا
رکھتا ہوا فصیل پہ سر روشنی کا تھا

کیا سوچ کر تم ایسے سفر پر نکل پڑے
امکاں نہ جس سفر سے کوئی واپسی کا تھا

اگر چھوئیں بھی تو شبنم کی طرح اُڑ جائے
وہ عکس جیسے سرابوں کا سلسلہ سا ہے

مبادا میں اس کا تعاقب کروں
وہ جاتے ہوئے رہگزر لے گیا

مشت بھر خاک ہی رستہ کی اٹھا کر دیدے
کچھ ترا ہاتھ بھی منزل کی نشانی میں رہے

چہرہ اگرچہ اپنا نہیں دوسرے کا ہے
خوش پھر بھی عکس دیکھ کے ہیں آئینوں میں لوگ

"رشتۂ کلام" جدید غزل کا دلنواز مجموعہ ہے۔

(عنوان چشتی)

لذّت لفظوں کی

مصنف : راج نرائن رازؔ

ناشر : سمت نامہ پبلی کیشنز۔ راجندر نگر نئی دہلی

قیمت :

راج نرائن راز کے حالیہ مجموعے " لذّت لفظوں کی " کے شایع ہونے اور اس کے مطالعے سے قبل ان کی شاعری کے بارے میں خیال تھا کہ راز صاحب کیونکہ " جدید " شاعر ہیں اس لیے ان کی شاعری میں بھی تنہائی، صنعتی معاشرے کی وجہ سے پیدا ہونے والے خوف و ہراس " دہشت " اور " فرد کی ذات کے کرب " کو بالکل اسی طرح " موضوع " بنایا گیا ہوگا، جیسے " جدید " کہلانے کے شوق میں بعض نام نہاد جدید شاعر بناتے رہے ہیں —— لیکن راج نرائن راز کے اس مجموعے کے مطالعے سے پہلا احساس یہ ہوا کہ ہر معقول ادیب و شاعر کو جیسے بھی ہو، اپنا مجموعہ شائع کرنا ہی چاہیے کیونکہ صرف اسی صورت میں قاری پر اس کی تخلیقی صلاحیت کا مجموعی اور بڑی حد تک درست انکشاف ممکن ہے —— اور دوسرا احساس یہ ہوا کہ " جدید شاعری کا ملجا و ماوا بن جانے والے مذکورہ بالا موضوعات کی تکرار سے نرے موزوں طبع لوگ کچھ رسائل کے مدیروں یا یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو کے صدور کو تو سیدھا کرنے اور ان موضوعات پر سطحی نکتہ چینی کو " تنقید " قرار دینے کا کام تو لے سکتے ہیں لیکن —— راج نرائن راز کی طرح بیسویں صدی کے انسانی ابتلا کو " احساس " کے طور پر اپنی شاعری میں برتنا ان کے مقدر میں نہیں ہے۔

" موضوع " اور " احساس " کے الفاظ استعمال کرنے سے میری مراد یہ ہے کہ جدیدیت کے رجحان کو شہرتیں سمیٹنے کا ذریعہ بنانے والے خام کار ذہنوں نے موجودہ صدی کے انسانی مسائل اور حساس افراد کو درپیش باطنی زحمتوں کو بالکل اسی طرح اپنی تحریروں کا موضوع بنالیا ہے جیسے کسی زمانے میں ترقی پسندوں نے سیاسی و سماجی شعور کو اکہری سطح پر اپنا

موضوع قرار دے لیا تھا۔ بہ الفاظ دیگر " فیشنی جدیدے " ایک طرح سے ان ترقی پسندوں کے ناجائز ورثے سمیٹنے کا کام انجام دیتے رہے ہیں جنھوں نے مخدوم محی الدین، اختر الایمان، احمد ندیم قاسمی، منٹو اور راجندر سنگھ بیدی جیسے شاعروں اور افسانہ نگاروں کے برخلاف ترقی پسند نظریے کو روزی روٹی کمانے کا وسیلہ بنا لیا تھا۔

راج نرائن راز کا اوّلین شعری مجموعہ " چاندنی اساڑھ کی " ۱۹۶۷ء میں شایع ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب جدیدیت کے نام سے شناخت کیے جانے والے تخلیقی رویّے برصغیر کی ادبی فضا پر بڑی حد تک حاوی آ چکے تھے۔ ایسی صورت میں راج نرائن راز کے لیے یہ کام بہت آسان تھا کہ وہ تنہائی، انتشار، دہشت، زوال اور شخصیت کے بکھراؤ کو سطحی انداز میں اپنی شاعری کا محور بنا لیتے ـــــ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برخلاف انھوں نے عالمی احساسات کو احساس ہی کے طور پر اپنی فنی شخصیت میں جگہ دی اور سطحی بیان کے ذریعے ان احساسات کو " موضوع " کے تنگ نائے میں نہیں گرایا ـــــ اس بات کو راز صاحب کے ایک شعر کے وسیلے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

اپنی آواز کے جادو پہ بھروسہ کرتے
مور جو نقش تھا دیوار پہ ناچا ہوتا

اپنے آپ کو جدید کہلوانے کے شوقینوں کی تحریروں میں پائے جانے والے ہم عصر فکر کے بیشتر نقوش جامد و ساکن ہیں کیونکہ ان متعدد لوگوں کو صرف یہی شوق تھا اور اب بھی ہے کہ اپنے آپ کو جدید شاعروں کی صف میں شامل کر سکیں۔ ان لوگوں میں ادب و فن کا وہ خلوص ناپید ہے جو اپنی آواز کی تلاش اور پہچان کے لیے لازمی ہوتا ہے۔ آواز کی تلاش اور پھر پہچان کے بعد ہی وہ منزل آتی ہے جہاں فن کار اس آواز کو ایسے جادو میں تبدیل کرنے پر قدرت حاصل کر پاتا ہے جو جامد و ساکن نقوش کو تحرک و رقص کے خصائص عطا کرتی ہے۔ راج نرائن راز کی پوری شاعری اس امر کی گواہ ہے کہ انہوں نے اپنے فنی خلوص کو پوری طرح

بروئے کار لاکر ہم عصر فکر کو اپنی شخصیت میں گھلایا ملایا ہے اور اس کے بعد ہی وہ اظہار کی منزل تک آئے ہیں۔

راج نرائن رازؔ کی شاعری کے بیشتر نقوش متحرک و رقص کناں اسی لیے ہیں کہ انھوں نے ان کی تجسیم سے قبل اپنی آواز کی تلاش اور اس میں سحر آفرینی کی دشوار گذار منزلیں طے کی ہیں۔ جب ہم پڑھتے ہیں کہ

مرا وجود غنیمت ہے سوچیے تو سہی
میں خشک ڈال کا پتّا ہرا ہرا سا ہوں

اور

اس شہرِ پُر آشوب کے ہنگامہ و شر میں
زیتوں کی ڈالی ہوں کہیں شاخِ حنا ہوں

تو ایک بارگی گمان گذرتا ہے کہ راج نرائن رازؔ نے ان اشعار میں کلاسیکی غزل والی "تعلی" سے کام لیا ہے — لیکن یہ صرف گمان ہی ہے۔ دیوار پر بنے ہوئے ساکت مور کو متحرک عطا کرنے کی منزل تک رسائی پانے کی زحمتیں برداشت کرنے والا تخلیق کار، صرف اسی وقت آمادہ سفر ہوا ہے جب اس نے تحریک کی ضرورت کو محسوس کر لیا ہے۔ اس احساس کے بیدار ہونے کا واضح مطلب یہ ہے کہ تخلیق کار میں وہ شے جنم پا چکی ہے جسے صوفیائے کرام نے "ایقان" سے موسوم کیا ہے۔ ایقان ظاہر ہے کہ کوئی یک جہتی صلاحیت نہیں بلکہ اس کا دائرہ کار فرد کے خارجی عواقب و جوانب اور اس کی اپنی شخصیت کی اندرونی تہوں تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اسی ایقان کے طفیل راج نرائن رازؔ اپنے تخلیقی وجود کے بارے میں مذکورہ دو شعر کہہ سکے ہیں۔ ان دونوں اشعار کے اسکرین پر صرف فن کار ہی کا وجود روشن نہیں بلکہ ان کے پس پردہ وہ عصری آگہی بھی کارفرما ہے جس کی مدد سے فن کار نے اپنے عہد کی بنجر صورتِ حال کو جانا ہے اور اس میں یہ احساس پیدا کیا ہے کہ اس زمانے

میں تازگی و بالیدگی کا معمولی سا ثبوت بھی نہایت غنیمت ہے۔ زیتون و حنا کی شاخ سے مماثلت کا احساس بھی اسی ایقان کی گواہی ہے۔ خشک ڈال کے پتّے اور شہر پُر آشوب کی شاخ زیتون و حنا پر غور کیجیے، اگر آپ نرے مدرس نہیں ہیں تو بہ آسانی محسوس کر سکتے ہیں کہ راج نرائن رازؔ کا یہ خیال کسی فیشنی عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ نام نہاد نقادوں کے کاندھوں پر سوار فیشنی شاعروں کی شاعری کہی جانے والی عجیب سی شے کے برخلاف موضوع کے بجائے احساس کی شکل میں تخلیق بن کر ابھرا ہے۔

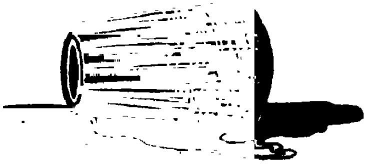
رازؔ صاحب کی ایک نظم "حاصل سفر کا" سے ایک اقتباس

" تنہائی کی خاموشی — یہ گھونٹ ہے اک زہر قاتل کا
گھونٹ ہے اک امرت کا بھی، یہ
گھونٹ میں دونوں پی لیتا ہوں
شہر زیاں میں کھو جاتا ہوں
رات گئے اُجلے بستر پر
سو جاتا ہوں
پہلی کرن کے ساتھ
سنہری پگڈنڈی کا ہو جاتا ہوں

تنہائی اور شہرِ زیاں کے اس ذکر میں کسی فیشن کے بجائے تخلیق کار کا وہ مقدر کارفرما ہے جو میرؔ، غالبؔ، فراقؔ، ناصر کاظمی جیسے خلاق ذہنوں کے حصے میں آتا رہا ہے۔ اس اقتباس ہی میں سنہری پگڈنڈی کا ذکر اس مثبت رویّہ کا مظہر ہے جو ہر اہم تخلیقی شخصیت میں فنکارانہ تنہائی کے باوجود کارفرما رہتا ہے۔ یہ مثبت اور پُر اُمید رویّہ ظاہر ہے کہ کسی سیاسی منشور کی کوکھ سے نہیں بلکہ انسانی صورتِ حال سے پیدا ہوا ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ ہر قابل ذکر تخلیق کار کی طرح راج نرائن رازؔ کی شاعری میں بھی انسانی ذہن

اور کوائف کی وہ وحدت ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے جو سفید و سیاہ خوب و زشت اور بلند و پست کے خانوں میں منقسم نہیں ہوتی۔ اس وحدت کا ایک حصہ امید ہے، تنہائی بھی ہے، زہر ہے اور امرت بھی ــــ اسی وحدت کے ایقان نے راج نرائن رازؔ کو ان احساسات کا محرم بنایا ہے جو راتوں کے اندھیروں میں یادوں کی چاندنی کی طرح چمک چمک اٹھتے ہیں اور خلاق راز کے خیال کے آنگن کو ان لذتوں سے روشناس کرتے ہیں جو لفظوں کے تخلیقی برتاؤ سے خالق کو نصیب ہوتی ہے اور پھر اس کے قاری کو بھی ــــ اور جس کا مکمل بیان مجھ جیسے نامکمل قاری کے لیے لفظوں سے ماورا ہے۔

انجم عثمانی



[illegible] devoted to literature, culture and the Arts

Est. 1977

TANAZUR

Registered with the Registrar of News Papers of India

تناظر

رضا نمبر

(ضخامت چھ سو صفحات)

کالی داس گپتا رضاؔ

اُردو زبان اور تہذیب کا عظیم مجاہد جس کی شخصیت تخلیق، تنقید اور تحقیق کا بے مثل سنگم ہے

اور

جو پورے بیس سال برِّ اعظم افریقہ اور پچھلے دہے سے وطنِ عزیز میں ایک گوشہ نشین فقیر کی طرح چپ چاپ شمعِ اُردو کو زندہ اور تابندہ رکھے ہوئے ہے۔

• • •

آدمی کا کام اُس کے نام اور مرتبے سے ہمیشہ بلند ہوتا ہے۔ ادارۂ تناظر اردو کے اِس سادھونت کے کام کے جائزے کے طور پر ایک خصوصی شمارہ مرتب کر رہا ہے۔

بلراج ورما

Just as it is good to produce and sell quality products, it is equally good to advertise in 'Tanazur h is read by the whole world of Urdu knowing public in India and abroad. We seek your patronage vite you to send us your advertisements.

Rates

Back Cover	Rs.	1200/-
Inside Cover	Rs.	1000/-
Full Page	Rs.	800/-
Half Page	Rs.	500/-

Mechanical Data

Size (Trimmed)	22 14.5 cms.
No. of cols,	1 (One)
Width of col.	10.5 cms.
Length of col.	19 cms.
Printed area (Full page)	19 × 10.5 cms.

While each of our collaborators gets his/her complimentary copy, we shall be glad to reserve his/her additional requirement of copies should he/ she lets us know in advance. He/She will be entitled to 25 percent special discount on each copy, which will be sent by Registered post at the cost of Management.

To Agents/Book Seller

The Quarterly 'Tanazur' is printed on good quality white paper by photo off set process. Each issue comprises 160-200 pages and costs Rs. 12/-.

Orders for less than 5 copies are not accepted unless money is sent in advance. On orders of 5 copies 20% 6-10 copies 25% 11-20 copies 30% and above 20 copies 40% discount is allowed. Copies are sent by V.P.P. A further discount of 5% is allowed if money is received in advance by Demand Draft/Money Order (in favour of Tanazur Publications. Delhi) and copies will be sent by Registered post at the expense of the Management.

(Mukti Verma)

Manager

TANAZUR PUBLICATIONS

Sangeet Natak Akademi

Rabindra Bhavan, Ferozeshah Road, New Delhi-110001

Some Important Publications :

ENGLISH

1.	Anthology of One Hundred Songs of Rabindra Nath Tagore in Staff Notation Vol. I	Rs. 25.00
2	Anthology of One Hundred Songs of Rabindra Nath Tagore in Staff Notation Vol. II	Rs. 45.00
3	Kutiyattam by Dr. Kunjuni Raja	Rs. 2.00
4	Sangeet Natak Akademi Bulletin "Togore Centenary" Number	Rs. 10.00
5	Monograph on Mushtaq Hussain Khan by Smt. Naina Ripjit Singh	Rs 2.50
6	Monograph on Muthukumara Pillai by Mohan Khokar	Rs 2 50
7	Classical Indian Dance in Literature and the Arts by Dr Kapila Vatsyayan	Rs. 140 00
8.	Music Dance in Rabindra Nath Tagore's Education Philosophy by Santidev Ghose	Rs 20 00
9	The Winged form . Aesthetical Essays on Hindustani Rhythm by Prof S.K. Saxena	Rs. 35.00
10.	Ravana Chhaya by Jiwan Pani	Rs 12.00
11	Monograph on Karyala by S.S.S. Thakur	Rs. 20.00
12	Monograph on Malushahi by Mohan Upreti	Rs. 30.00

HINDI

1	Sangitagya-Ka-Sansmaran by the late Ustad Vilayat Hussain Khan	Rs. 5 00
2.	Anthology of One Hundred Songs of Rabindra Nath Tagore in Akademi Notation Vol. I	Rs. 20.00
3.	Monograph on Onkarnath Thakur by Vinay Chandra Maudgalya	Rs. 2.50
4	Sahasarasa	Rs. 25.00
5.	Thyagaraja Kriti Sangraha	Rs. 20.00
6.	Paschatya Sangeet Aur Uski Swarlipi	Rs. 5.00
7	Rasleela Tatha Rasnukaran Vikas by B. Yamdagni	Rs. 100.00

In addition, the Akademi publishes a quarterly journal "Sangeet Natak" which costs Rs 5/- per copy. Annual Subscription of the journal is Rs. 15/-.


N. 40608/83